تاریخِ اَدَب میں اپنی نوعیت کا پہلا رُومان

قمر زمانی بیگم

علامہ نیاز فتحپوری کی انوکھی داستانِ معاشقہ

ترتیب و پیشکش

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

اُردو اکیڈمی سندھ کراچی

قمر زمانی بیگم

علامہ نیاز فتح پوری (مرحوم) کی زندگی کا ایک گمشدہ ورق

اور

تاریخ ادب کا ایک قیمتی صحیفہ

★

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

اردو اکیڈمی سندھ کراچی

جملہ حقوق محفوظ

۱۹۷۹ء

★

دوسری بار

★

پہلی بار کتابی صورت میں ۱۹۷۹ء

★

مطبوعہ

باب الاسلام پرنٹنگ پریس کراچی

★★

انتساب

ملک کے ممتاز ادیب دانشور ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب

اور سیّد حسام الدین راشدی صاحب کے نام کہ انھیں

کی قدردانی و جوہرشناسی مولانا نیاز فتح پوری (مرحُوم) کو

آخری عمر میں پاکستان کھینچ لائی اور انھیں کی علم دوستی و ادب

نوازی قمر زمانی بیگم کے قیمتی خطوط کی محافظ بن گئی۔

فرمان فتح پوری

فہرست مضامین

۱۔ انتساب	۱
۲۔ کتاب سے پہلے	۳ تا ۸
۳ - قمر زمانی بیگم کی ادبی زندگی کا آغاز و پس منظر	۸ تا ۱۷
۴۔ قمر زمانی بیگم اور مدیر "نقاد" کی داستان معاشقہ	۱۸ تا ۱۲۴
۵ - نقاد اور مدیر نقاد کی زندگی پر ایک نظر	۱۲۵ تا ۱۴۶

کتاب سے پہلے

قمر زمانی بیگم انیسویں صدی عیسوی کی آخری دھائیوں میں پیدا ہوئیں اور پندرہ سولہ سال کی عمر سے لکھنے پڑھنے لگیں۔ ادب و صحافت دونوں میں جس تیزی سے قمر زمانی بیگم کو شہرت و عزت نصیب ہوئی کم لوگوں کو ملتی ہے۔ چنانچہ بیسویں صدی کی پہلی دھائی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ان کی شہرت عام ہوگئی۔ مولانا شبلی، مولانا حالی، وحیدالدین سلیم، اکبر الہ آبادی اور مہدی افادی وغیرہ بزرگ کی حیثیت سے ان کی تحریروں کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریاآبادی، مولانا حامد حسن قادری، ل۔ احمد اور ملا واحدی وغیرہ تقریباً ہم عمر و ہمعصر ہونے کی حیثیت سے ان کے زور قلم کے مداح تھے۔ اگرچہ انجمن آرائی کا شوق قمر زمانی کو نہ تھا لیکن ان کے قلم نے انھیں شمع محفل بنا رکھا تھا۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء تک کا زمانہ ان کی شہرت کے عروج کا زمانہ تھا۔ تعلیم یافتہ نوجوان خاص طور پر ان کی تحریروں کے شیدائی تھے اور اُن سے ملاقات کے لیے دلی اور آگرہ کے چکر لگایا کرتے تھے۔ ان کی جو داستان محبت اس کتاب میں بیان کی گئی وہ اُسی زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ قمر زمانی بیگم اور ان کی داستان محبت کا ذکر ضمناً اس سے پہلے بھی اُردو کے بعض نامور اہل قلم نے کیا ہے۔ اس سلسلے میں دو مضمون خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ میری مراد مجنوں گورکھپوری اور مالک رام صاحب کے مضامین سے ہے مجنوں صاحب کا مضمون یکم جولائی ۱۹۶۳ء کے "ہماری زبان" (علی گڑھ) میں اور مالک رام صاحب کا مضمون جولائی ۱۹۶۶ء کے "آجکل" (دہلی) میں چھپا تھا۔ مالک رام صاحب کا مضمون نگار پاکستان (کراچی) بابت ستمبر ۱۹۶۶ء میں دوبارہ شائع ہوا۔ ان دونوں بزرگوں نے نیاز فتح پوری مرحوم سے یا ان کے دوستوں سے قمر زمانی کے بارے میں جو کچھ سن رکھا تھا اسے اپنے اپنے مضمون میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ ان میں سے کسی کو بھی اصل واقعہ کی پوری خبر نہ تھی اور کسی کی نظر سے قمر زمانی کے وہ خطوط نہ گزرے تھے جو آج پہلی بار اس کتاب کے ذریعہ منظر عام پر آ رہے ہیں، اس لیے یہ مضامین ایک سرسری اطلاع کے سوا اصل داستان کے بارے میں کچھ اور بہم نہ پہنچا سکے۔ قمر زمانی اور دلگیر کے درمیان خط و کتابت کب شروع ہوئی، کب تک جاری رہی، ان خطوں کی کیا نوعیت تھی، یہ خطوط کہاں سے

اور کس طرح پوسٹ کئے جاتے تھے۔ قمر زمانی کے روپ میں شاہ دلگیر سے کون ملا تھا۔ اس دلچسپ تاریخی ڈرامے میں علامہ نیاز فتح پوری کے علاوہ اور کون کون سے کردار کام کر رہے تھے۔ ان سوالوں کے جوابات کے بارے میں مجنوں گورکھپوری اور مالک رام صاحب کے مضامین کوئی مفید اطلاع فراہم نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ قمر زمانی بیگم کے متعلق جو معلومات ان مضامین میں ہم پہنچائی گئی تھیں ان سے ادب کے قارئین مطمئن نہ ہوئے چنانچہ ایس نورالحسن انور ادیب نے مراسلہ کی شکل میں "ہماری زبان" (علیگڑھ) میں قمر زمانی کے بارے میں مندرجہ ذیل استفسار شائع کیا:

"ماہنامہ آج کل بابت جولائی ۱۹۶۶ء میں جناب مالک رام صاحب کا ایک مضمون "نیاز فتح پوری" کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس میں مصنفہ قمر زمانی بیگم کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے .... جناب مالک رام نے یہ جملہ بھی لکھا ہے:

"میں نے نیاز کی زندگی میں ان سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ خود یہ سارا واقعہ قلم بند کر کے شائع کر دیں یا پھر مجھے اجازت دیں کہ اسے لکھ دوں لیکن بوجوہ ان دونوں پر وہ رضامند نہ ہوئے۔"

یکم جون ۱۹۶۳ء کے "ہماری زبان" میں جناب مجنوں گورکھپوری نے "قمر زمانی ایک یاد" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اس میں انہوں نے بھی قمر زمانی کی شاہ دلگیر سے دلی والی ملاقات کا ذکر کیا ہے، مگر گفتگو کے متعلق کچھ نہیں لکھا بس لکھا ہے کہ پردے کے پیچھے سے "دست نگاریں" کی ایک جھلک دکھائی گئی تھی۔ جناب مجنوں گورکھپوری نے یہ بھی لکھا ہے کہ "شاہ دلگیر کو قمر زمانی کے عورت ہونے کا یقین ایمان بالغیب کی حد تک تھا۔" اس کے ثبوت میں انہوں نے لکھا ہے کہ: شاہ دلگیر نے مہدی افادی کو کچھ یوں لکھا تھا:

"قمر زمانی کے وجود کا مجھے اس طرح یقین ہے جس طرح خود اپنے وجود کا۔"

جناب مجنوں گورکھپوری نے لکھا ہے کہ انہیں قمر زمانی کی سرگذشت نیاز ہی نے سنائی تھی اپنے مضمون کے آخر میں مجنوں گورکھپوری نے یہ جملہ لکھا تھا:

"نیاز صاحب ابھی زندہ ہیں۔ خدا ان کو زندہ رکھے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ خود اپنی زبان سے لوگوں کو مفصل بتا دیں کہ قمر زمانی کی اصلیت کیا تھی اور شاہ دلگیر کو پردے کی آڑ سے کس نے ہاتھ دکھایا تھا۔ یہ داستان اردو ادب کے مورخین اور محققین کے لئے صحت بخش ہوگی۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اہل تحقیق قمر زمانی کے شجرۂ نسب، ان کے سوانح حیات، ان کی سیرت و صورت، ان کی پیدائش اور وفات کے سن اور اولاد کے متعلق اپنے اپنے شواہد فراہم کریں

نیاز صاحب اردو ادب کی تاریخ کو اس خطرے سے بچا سکتے ہیں۔"

جناب مالک رام نے نیاز سے اس واقعہ کو بیان کرنے کی اجازت چاہی تو نیاز مرحوم نے انہیں اجازت نہ دی۔ جناب مجنوں گورکھپوری نے یہاں تک لکھا ہے کہ اسے راز میں رکھنا اردو ادب کی تاریخ کے لئے خطرے سے خالی نہیں۔ اس کے باوجود نیاز نے اپنے پرچے میں کہیں اشارۃً بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ یہ راز، راز ہی رہا۔ شاہ دلگیر کی ملاقات قمر زمانی سے، جناب مالک رام اور مجنوں گورکھپوری نے الگ الگ طریقے سے بیان کی ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے لکھا تھا کہ چلمن کے پیچھے سے کسی کا "دست رنگین" شاہ دلگیر کو دکھلایا تھا جناب مالک رام کہتے ہیں کہ ایک برقعہ پوش خاتون نے شاہ دلگیر کے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کی ہو سکتا ہے کوئی صاحب کچھ اور لکھیں۔

جناب مجنوں گورکھپوری نے قمر زمانی کے یہ دو شعر بھی لکھے ہیں ؎

دل ہو ہی چکا ان کا مہر کیسی وفا کیش

اب درس تغافل دے اے مصلحت اندیشی

کیا پوچھتے ہو کس کو ہے شکوہ دلریشی

فرماتے رہو تم تو تجدید ستم کیشی!

اور جناب مالک رام نے لکھا ہے کہ انہیں یقین ہے کہ قمر زمانی اور شاہ دلگیر کی پوری خط و کتابت ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی کے خاندان میں محفوظ ہوگی۔ اگر ایسا ہے تو یقیناً ان خطوں سے قمر زمانی پر کچھ روشنی پڑ سکتی ہے اور اسی روشنی سے اردو ادب کی تاریخ، آئندہ لکھے جانے والے کچھ جھوٹے واقعات سے بچ جائے گی۔ کیا کوئی خدا کا بندہ قمر زمانی اور نیاز کی کڑیوں کو ملانے کی کوشش کرے گا۔"

(الیس نور الحسن الور ادیب)

میں نے اس استفسار کا مختصر سا جواب "ہماری زبان" (علی گڑھ) کو بھیج دیا تھا اور بعد کو یہی جواب مع استفسار ہماری زبان سے نگار پاکستان (کراچی) بابت مارچ ۱۹۶۷ء میں نقل ہوا۔ حق بات یہ ہے کہ یہی استفسار قمر زمانی بیگم کی داستان محبت اور ان کے مکتوبات کو کتابی صورت میں جلد پیش کرنے کا محرک بن گیا۔ قمر زمانی کے یہ خطوط جن کی مدد سے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے علامہ نیاز فتح پوری مرحوم کے یار غار ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی مرحوم کے پاس محفوظ تھے۔ نیاز صاحب کراچی آئے تو ہاشمی صاحب نے یہ خطوط نیاز صاحب کے حوالے کئے۔ میں نے نیاز صاحب سے اصرار کیا کہ وہ خطوط کو شائع کر دیں۔ چنانچہ وہ اس پر رضامند ہو گئے اور اکتوبر ۱۹۶۳ء کے نگار میں صفحہ اشارہ

پر مندرجہ ذیل اشتہار بھی شائع کر دیا:

پچاس سال کا ایک رازِ سربستہ

قمر زمانی

کی

نقاب کشائی

یعنی

نیاز کی زندگی کا ایک پوشیدہ ورق

خود حضرت نیاز کے قلم سے

غالب کا شعر ہے ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ

کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

لیکن یہ کتاب اصلاح ہے اس شعر کی اور اس طرح کہ ؎

عشق پہ زور ہے اور ہے یہ وہ آتش غالبؔ

کہ لگائے بھی لگے اور بجھائے بھی بنے

تاریخ ادب میں اپنی نوعیّت کا پہلا رُومان

جس کا تقاضا پچاس سال سے ہو رہا تھا اور اب پورا ہوا۔ نہایت نفیس کاغذ پر مجلد مع تصاویر زیر ترتیب ہے۔"

ماہنامہ نگار، اکتوبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۸

لیکن نیاز صاحب ان خطوط کو یوں مرتب نہ کر سکے کہ وہ بغیر کسی ترتیب کے بکھرے پڑے تھے۔ انہیں تاریخ وار ترتیب دینا ان کی نقلیں تیار کرانا اور بعد ازاں ضروری وضاحتوں کے ساتھ انہیں ایک معنوی رشتے میں پرونا آسان نہ تھا۔ یہ کام خاصا وقت چاہتا تھا۔ نیاز صاحب ان دنوں نیشنل میوزیم کراچی اور ترقی اردو بورڈ کراچی کے کاموں میں منہمک تھے۔ روزنامہ جنگ کے لئے ہفتہ وار کالم اور نگار کے لئے ملاحظات بھی انہیں لکھنے پڑتے تھے۔ ایسی صورت میں قمر زمانی کے مکتوبات کی ترتیب کے لئے وقت نکالنا نیاز صاحب کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ سب سے بڑی دشواری

یہ بھی کہ ان مکتوبات میں قمر زمانی اور ان کے معاصرین کی جن تخلیقات کا ذکر ملتا ہے اگرچہ وہ "نقاد" میں شائع ہو چکی تھی لیکن دستیاب نہ تھیں۔ میرے ذاتی کتب خانے میں "نقاد" کے ابتدائی تیس پرچے موجود تھے۔ لیکن وہ اس کام کے لئے ناکافی تھے۔ نیاز صاحب کے حکم پر میں نے کراچی کے پبلک اور ذاتی کتب خانوں کی چھان بین شروع کی لیکن "نقاد" کے پرچے کہیں نظر نہ آئے۔ نتیجتہً نیاز صاحب کو قمر زمانی کے خطوط کی ترتیب و اشاعت کو ملتوی کرنا پڑا۔ یہ ضرور ہوا کہ مولانا مرحوم نے قمر زمانی کے سلسلے کے سارے خطوط سید حسام الدین راشدی صاحب اور ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب کی معرفت قومی کتب خانہ کراچی کے حوالے کر دیئے اور ان کی ایک نقل مجھے دے کر کہا میرے مرنے کے بعد انہیں شائع کر دینا۔ یہ کتاب دراصل انہیں کے حکم کی تعمیل ہے۔ تعمیل حکم کی صورت یوں نکل آئی کہ "نقاد" کے دور آخر کے وہ پندرہ پرچے جن کے بغیر اس کتاب کو مرتب کرنا مشکل ہو رہا تھا محترمی بشیر حسین ضیائی مقیم لاہور کے کتب خانے میں نکل آئے اور مجھے ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ کتاب کے آخر میں ماہنامہ "نقاد" اور اس کے مدیروں کی زندگی اور ادبی خدمات کا بھی مختصر سا خاکہ بھی دے دیا گیا ہے تاکہ قمر زمانی بیگم کی داستان پورے حقائق کے ساتھ ذہن میں ابھر سکے اور اس کی ادبی و تاریخی اہمیت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے۔ یقین ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اردو ادب کے مورخین و محققین قمر زمانی اور علامہ نیاز فتح پوری مرحوم کے باب میں کسی مغالطے کا شکار نہ ہوں گے اور آئندہ کے لئے ان خدشات کا خاتمہ ہو جائے گا، جن کا اظہار ایس محمد الحسن انور ادیب صاحب نے اپنے انتشار مطبوعہ ہماری زبان علی گڑھ میں کیا ہے۔

اس کتاب کا مواد بعض وجوہ سے خاصا رومان پرور بلکہ سنسنی خیز ہے اور اگر میں چاہتا تو سستی پبلسٹی کے لئے اسے ڈائجسٹ نما کسی کثیر الاشاعت پرچے میں شائع کرا دیتا لیکن میں نے دانستہ اس سے گریز کیا۔ بات یہ ہے کہ یہ رومان پرور تحریریں جو قمر زمانی بیگم کے نام سے آج منظر عام پر آ رہی ہیں اردو ادب کے نثری سرمایہ کا ایک نہایت قیمتی حصہ ہیں۔ ان کا لب و لہجہ موضوع کی طرفگی کے باوصف بلند درجہ تخلیقی اور سنجیدہ ہے اور ادب کے قاری سے مطالبہ کرتا ہے کہ ان کا مطالعہ چٹخارہ کے ساتھ نہیں سنجیدگی سے کیا جائے۔ یہ تحریریں ایک خاص عہد کے اُردو نثر کی نمائندہ اور نمائندہ ادیبوں کی تخلیقات ہیں اور اس لحاظ سے اس بات کی ضرورت تھی کہ انہیں کتابی صورت میں محفوظ کر لیا جائے۔ میں نے اسی ضرورت کو مولانا نیاز مرحوم کی خواہش کے مطابق پورا کرنے کی سنجیدہ کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں اس کا صحیح جواب اس کتاب کے قارئین ہی دے سکیں گے۔

فرمان فتح پوری

قمر زمانی بیگم کی ادبی زندگی کا آغاز اور پس منظر

قمر زمانی بیگم کون ہیں؟ کیا ہیں؟ کہاں ہیں اور ان کی اہمیت کیا ہے؟ ان سوالوں کے مفصل جوابات آپ کو اس کتاب کے مطالعہ سے خود معلوم ہو جائیں گے۔ ابتدا اتنا ضرور کہنا ہے کہ ان کے اور ان کے معاشقے کی جو داستان یہاں بیان کی جا رہی ہے وہ فرضی نہیں حقیقی ہے من گھڑت نہیں سچا واقعہ ہے۔ محض ایک رنگین و رومان پرور کہانی نہیں، ادبی تاریخ کا ایک دلکش باب ہے معمولی اشخاص کی زندگی کی تفصیل نہیں، علم و ادب کی غیر معمولی شخصیتوں کا مرقع ہے۔ سنی سنائی باتوں کا مصنوعی مجموعہ نہیں، خطوط کی صورت میں ایک خاص عہد کی ادبی دستاویز ہے۔ سرسری، بے کیف اور بے معنی تحریروں کی پوٹ نہیں بلکہ معنی خیز انشاپردازی اور دل کو مزہ دینے والی ادبیت کا نشاط خیز سرمایہ ہے۔ محض دو دلوں کا ربط نہیں، ایک پورے عہد کے نغمات روح کا ساز ہے۔ ایسا ساز جس پر اگر آپ چاہیں تو دوسروں کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ اپنے دل کی آواز بھی سن سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے آپ کو تھوڑی دیر کے لئے میرے ساتھ اس خاص ماحول اور خاص عہد میں چلنا پڑے گا جس میں قمر زمانی بیگم پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں۔

اب سے ساٹھ سال پہلے کی بات ہے بیسویں صدی عیسوی اپنی دسویں سالگرہ منا کر دوسری دہائی میں داخل ہو رہی تھی۔ لکھنؤ، رام پور، دلی، آگرہ، لاہور، حیدرآباد اور بھوپال میں اردو صحافت اور ادب کے مرکز قائم تھے۔ اردو کے اکثر ادیب و شاعر اور صحافی مختلف گوشوں سے سمٹ کر ان مقامات پہ جمع ہو گئے تھے۔ ان میں بوڑھے بھی تھے، ادھیڑ بھی اور ایسے بھی جن کی چڑھتی جوانیاں تھیں۔ پرانوں میں ڈپٹی نذیر احمد، اکبر الہ آبادی، عبدالحلیم شرر، مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حالی ابھی حیات تھے۔ علامہ اقبال، چکبست، مولانا حسرت موہانی، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، نظم طباطبائی اور شوق قدوائی کی شاعری کا سورج تیزی سے بلندی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جوش ملیح آبادی، سیماب، جگر اور آرزو لکھنوی کی ابھرتی ہوئی آوازیں بھی لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے لگی تھیں، طوطا مینا، لیلیٰ مجنوں، گل بکاؤلی اور طلسم ہوش ربا کی داستانوں کا دور ختم ہو گیا تھا۔ ان کی جگہ مغرب سے آئے ہوئے مختصر افسانے نے لے لی تھی۔ پریم چند سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش اور نیاز فتح پوری اس نئی صنف کو آگے بڑھا رہے تھے۔ صحافت میں مولانا ظفر علی خان، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر کا طوطی بول رہا تھا۔ پاک و ہند کے ہر چھوٹے بڑے شہر سے معیاری اخبار اور ادبی رسالے نکل رہے تھے۔ روزناموں میں زمیندار اور ہفت روزہ پرچوں میں الہلال دھوم مچائے ہوئے تھے۔ ماہنامہ ادبی پرچوں میں زمانہ، مخزن،

نظام المشائخ، ادیب، تمدن، صلائے عام، دلگداز، الناصر اور العصر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ لکھنے کو ناول، افسانہ، تنقید، تحقیق، علمی مضامین اور مذہبی مقالات سبھی لکھے جا رہے تھے لیکن ہر قسم کی تحریر کہیں عشق حقیقی کے پردے میں اور کہیں مجاز کے رنگ میں رومان پرور انشا پردازی میں ڈھلی ہوئی تھی۔ اس رومان پرور انشا پردازی کا دوسرا نام "انشائے لطیف" یا "شعرِ منثور" تھا۔ مہدی افادی، ابوالکلام آزاد، یلدرم، خلیقی، میر ناصر علی، نیاز فتح پوری اور دیگر اکبر آبادی وغیرہ اس قسم کی نثر کے علمبردار تھے۔ دراصل انہیں ہی کی بدولت رومان نگاری نے ایک مستقل اور مقبول رجحان کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور زبان و ادب کے قاری کو اس کا ایسا چٹخارہ لگ گیا تھا کہ نثر ہو یا نظم اس رنگ کے بغیر مقبول نہ ہوتی تھی۔ اس رومان انگیز ادبی فضا میں اردو کے ایک ممتاز انشا پرداز شاہ نظام الدین دلگیر نے بھی آگرہ سے نقاد نام کا ایک ماہنامہ نکالا[1]

نقاد کا پہلا پرچہ جنوری ۱۹۱۳ء میں بڑی آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے فضائے ادب پر چھا گیا۔ مولانا شبلی، مہدی افادی، اکبر الہ آبادی، شوق قدوائی، مولانا حسرت موہانی، ابوالکلام آزاد، ریاض خیر آبادی، مولانا حامد حسن قادری، نظم طبا طبائی سبھی اس کی محفل شعر و ادب میں شریک ہو گئے۔ ہر چند کہ نقاد میں زبان و ادب کے ساتھ ساتھ دوسرے علم و فنون پر بھی تنقیدی و تحقیقی مضامین شائع ہوتے تھے لیکن اس کے لکھنے والوں کا حلقہ کچھ ایسا تھا کہ یہ رسالہ بہت جلد اردو میں رومانوی تحریروں کا دلکش مُرقّع اور انشائے لطیف کی تحریک کا نمائندہ بن گیا۔ بات یہ تھی کہ اس رنگ کے بڑے انشا پرداز مثلاً مہدی افادی، نیاز فتح پوری، خلیقی، ضیا عباس ہاشمی اور خود نقاد کے مدیر دلگیر اکبر آبادی جن کی نثر رومان کا جادو جگاتی تھی سب کے سب حسن و عشق یا جمالیات کے سلسلے میں سقراط کے ایک شاگرد اور مشہور یونانی مفکر زینوفن کے فلسفۂ حسن و عشق سے متاثر تھے۔ اس فلسفے میں حسن و عشق اور عورت ایک ہی چیز کے مختلف نام تھے اور اسی کو اردو کے یہ رومان نگار اپنے فکر و خیال کا محور بنائے ہوئے تھے۔ چنانچہ نقاد کے پہلے ہی پرچے میں مہدی افادی کا مضمون "فلسفۂ حسن و عشق" شائع ہوا۔ اس فلسفے کو سمجھنے کے لئے اس کی چند سطریں دیکھتے چلئے:

"عورت کیا ہے۔ دنیا میں کیوں آئی؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ وہ محبت کی چیز ہے اور وہ محض اسی لئے آئی ہے۔ محبت ایک مقناطیسی شے ہے۔ عورت بغیر چاہنے والے کے رہ نہیں سکتی۔"

عورت کتنی ہی پاکیزہ وش کیوں نہ ہو اس خیال سے خالی نہیں ہوتی کہ کوئی اس کی کافرادائی کا شیدائی ہو۔ اس کی فتوحات اس کا سرمایہ نشاط ہیں جن سے اس کے

---

[1] "نقاد" کی تاریخی و ادبی اہمیت کی تفصیل اسی کتاب کے آخری صفحات میں ملے گی۔

دل کو راحت ملتی ہے اور جن سے وہ جیتے جی کبھی دست بردار نہیں ہو سکتی۔ وہ وار کر کے رہے گی کیونکہ یہ اس کی فطرت میں داخل ہے۔ شانہ سے آنچل خود نہ گرائے لیکن اگر اتفاق سے گر جائے تو وہ دل میں خوش ہو گی۔

آہ عورت تو فسانۂ زندگی ہے تو جس طرح ایک جھونپڑے کو اپنی صاف شفاف ہستی سے شیش محل بنا سکتی ہے۔ بڑے بڑے ایوان عیش کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تیری موجودگی کے آثار اس میں نہ پائے جائیں۔ اس کے لئے جھیڑوں کی جھنکار ضروری نہیں۔ محض تیرا پس پردہ ہونا کہیں ہر کسی کے لئے ہو کافی ہے۔"

اردو نثر نگاری کا یہ رنگ اس زمانے میں حد درجہ مقبول تھا۔ نوجوان لکھنے پڑھنے والے تو اس پر جان چھڑکتے تھے۔ نقاد کے مدیر دلگیر کی طبیعت کو بھی اس رنگ سے خاص مناسبت تھی اور وہ بھی اسی رنگ میں لکھتے تھے۔ نثر ہو یا نظم دونوں میں تخیل کی جولانیاں حد سے بڑھی ہوئی ہوتی تھیں اور حقیقی دنیا کے مقابلے میں خیالی دنیا زیادہ کیف پرور نظر آتی تھی۔ دلگیر کے مضمون کا ایک ٹکڑا دیکھئے جو "تصور جاناں" کے عنوان سے فروری ۱۹۱۳ء کے نقاد میں شائع ہوا ہے۔

"سنتے ہیں عاشق نامراد فرہاد کو جو لطف کوہ بے ستون میں اکیلے بیٹھ کر شیریں کے یاد کرنے اور شیریں کے ساتھ خیالی بیکہ میں گفتگو کرنے میں آتا ہے، کبھی خود شیریں کی محبت میں نہ آیا اور ایسے ہی ہم کو بھی دلربا صورتوں سے لگاؤ ہے، ان کے تصور کے ہر وقت تازہ رکھنے میں جو مزہ آتا ہے خود ان سے مل کر نہیں آتا۔"

مضمون کے اختتام پر ملٹن کا یہ قول درج ہے:

"اے عورت تو مخلوق کی سب سے بہتر نمونہ ہے۔ تو خدا کی انتہائی اور سب سے اعلیٰ مخلوق ہے، تجھ میں یعنی تیری ہستی میں سب اچھی چیزیں جو خیال اور نظر میں آسکتی تھی بدرجہ کمال موجود ہیں تو پاک ہے تو شان عرفان رکھتی ہے تو نرم اور خلیق ہے تو بہت مرغوب طبع ہے اور تو بہترین کائنات ہے۔"

اس سلسلے میں خلیقی دہلوی کے ایک مضمون کا اقتباس بھی بطور نمونہ دیکھتے چلئے:

"میری محبت کی نسبت انہیں اب کوئی حسن ظن نہیں رہا نہ سہی یہ میرا مقدر، میرے واسطے ان کی قلب میں اب کوئی گنجائش نہیں رہی نہ سہی، یہ میری تقدیر۔ مگر جن الزامات کو میرے ذمہ یقین کر لینے کی بنا پر وہ مجھ سے رنجیدہ ہوئے ہیں جن تہمتوں کی مجھ سے رو بمو کر انہوں نے عملاً تصدیق کر دی کاش ان سے تجھ کو آگاہ

کیا جاتا مجھے بات چیت کرنے کا موقع، مجھے عذر گناہ کے لئے فرصت عطا کی جائے۔"

میں سچ عرض کرتا ہوں میں دربار محبت میں شرمندہ عمل نہیں۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ محبت کے خلاف میرے دل میں کبھی کوئی مذموم تحریک پیدا نہیں ہوئی میں نے ہر دعوت آزمائش کو لبیک کہا۔ میں نے تمام احکامات کی غلامانہ اطاعت کی۔ میں نے خدا کی قسم دل میں کبھی معصیت کی پرورش نہیں کی۔ دیکھ لینا تم اپنے غلط وہم سے شرمندہ ہو گے اور افسوس کرو گے آہ مجھے معلوم نہیں، کیوں ان کی محبت شک و شبہ میں بدل گئی۔

ضیائے عباس ہاشمی صاحب کے انداز انشا پردازی اور تصویر خیالی کی بھی ایک جھلک دیکھتے چلئے "میں کیا کہوں" کے عنوان سے فروری ۱۹۱۲ء کے پرچے میں لکھتے ہیں:

"میں ایک مجسم خیال ہوں۔ میں ایک فرضی تصویر ہوں، میں عکس ہوں کسی کا۔ خدا معلوم کس کا۔ میں یہ کچھ بھی نہیں۔ میں خانہ معشوق کی دیوار پر ایک قد آدم آئنہ ہوں۔ مجھ میں یار اور اغیار دونوں کی صورتیں عکس فگن ہیں۔

چونکہ میری ابتدا عشق اور خواہش کے ضمیر سے ہے۔ اس لئے میں خواہشوں کا ایک مجموعہ ہوں۔ بیاض عشق کا مرقع ہوں۔ کتاب محبت کا ایک ورق ہوں۔ ورق کی طرح مجھے بھی نہیں معلوم مجھ میں کیا لکھا ہے اور یہ بھی خبر نہیں کہ مجھے کون پڑھے گا۔"

لیکن اس قسم کے نوجوان انشا پردازوں کے امام حقیقۃً "نیاز فتح پوری" تھے۔ اس وقت ان کا قیام دلی میں تھا اور ان کے قلم کی جولانیاں اردو نثر میں غضب کا رنگ و نور بکھیر رہی تھیں یونانیوں کے فلسفہ حسن و عشق کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا اور یورپ کے جمال پرست انشا نگاروں سے بھی وہ بہت متاثر تھے۔ طبعاً بھی حد درجہ رومان پسند واقع ہوئے تھے، اور جیسا کہ خود انہوں نے کئی جگہ اس کا اظہار کیا ہے، عورت ان کی کمزوری تھی لیکن یہی کمزوری ان کی تحریر کا حسن و زور بن گئی تھی۔ عورت اور اس کے حسن و جمال پر انہوں نے افسانے کی شکل میں نقاد میں مسلسل لکھا اور ایسی جادو اثری کے ساتھ کہ نوجوان طبقے کا ہر فرد، عورت ہو یا مرد، ان کی تحریروں پر ریجھ گیا۔ چنانچہ ان کے وہ رومانی افسانے جو تخیل کی رنگینی میں ڈوبے ہوئے ہیں پہلے پہل نقاد ہی میں شائع ہوئے۔ ان افسانوں میں عشق و حسن کے جس فلسفے کو انہوں نے موضوع بنایا تھا اس میں عورت کا مقام بہت بلند ہے۔ اس بلندی کا ذکر ایک جگہ نہیں بلکہ جگہ جگہ ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔ بطور نمونہ چند ٹکڑے دیکھئے:۔

"عورت ایک لذت ہے، مجسّم ایک تسکین ہے مشکل ایک سحر ہے مرنی ایک نور سے ملوّی"

"ایک حسین عورت کی جو حرکت ہے وہ ایک لطیف موسیقی ہے۔ حسن کا ساز نسائیت اور صرف نسائیت ہے۔ وہ ہاتھ ہلاتی ہے تو گویا ہوا میں نقش ترنم بنا دیتی ہے وہ چلتی ہے اور اپنے پیروں سے زمین پر نشانِ موسیقی چھوڑ جاتی ہے۔"

"عورت کائنات کی ساری حسین چیزوں کا نچوڑ ہے اور اس کے بغیر زندگی بے کیف اور بے روح ہے۔"

"عورت ایک روشنی ہے جسے ہم چھو سکتے ہیں، ایک نکہت ہے جس سے ہم گفتگو کر سکتے ہیں۔ وہ ایک شیرینی ہے جو ہاتھ سے چکھی جا سکتی ہے۔ وہ ایک موسیقی ہے جو آنکھوں سے سنی جا سکتی ہے۔"

"محبت ایک قسم کی نکہت ہے جو روح کی شگفتگی سے پیدا ہوتی ہے۔"

یہ تو عورت اور محبت کے متعلق نیاز کے رومانی خیالات ہیں۔ لیکن اگر عورت فی الوقت ان کے سامنے آجائے تو ان کے دل پر کیا گزر جاتی تھی اور وہ اس کی تصویر کس طرح کھینچتے تھے اس کی بھی ایک آدھ مثالیں دیکھتے چلئے۔ اپنے گڈھ کی راجپوت لڑکیوں کے متعلق لکھتے ہیں:

"ایک بات اور ہے کان میں کہنے کی تھی۔ مگر خیر سن لو۔ حوروں کو بنارس میں ہر جگہ ڈھونڈھن و ہم نظر آتا تھا لیکن یہاں ہر قدم پر سیتا و رادھا کا سامنا ہے۔ راجپوتوں کی لڑکیاں ہیں، بلند و بالا، صحیح و توانا، تیوریاں چڑھی ہوئی گردنیں تنی، آنکھوں میں تیر مانگوں میں عبیر، ابرو میں خنجر، بالوں میں عنبر، ہاتھوں میں مہندی ماتھے پہ بندی۔ کیا پوچھتے ہو کیا عالم ہے۔"

"چار بجے کا وقت ہے۔ گہرا ابر محیط ہے۔ پہاڑی کی خنک ہوائیں جسم میں سردی لیکن دماغ میں شراب کی سی گرمی پیدا کر رہی ہیں کہ دفعتہً بنگلہ سے باہر چہل پہل سی معلوم ہوئی۔ میں باہر نکلتا ہوں، معلوم نہیں غالب کا نگار آتشیں سر کھلا گیا تھا۔ یہاں تو ایک سمٹی ہوئی روشنی تھی، پیکر انسان میں۔ ایک قید کی ہوئی بجلی تھی عالم آب و گل میں۔ آنکھیں یکسر سحر بابل، لب ہمہ خون صد میخانہ اور اب پوچھئے کہ حسن کیا تھا۔ بس یوں سمجھئے کہ جوانی کانٹے پر تل رہی تھی۔"

وہ ہلکی ہلکی ریشم کی ساریاں اور ان ساریوں کے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے زر کے پلو وہ صدف آسا کانوں میں رنگین رخساروں سے چھو کر کانپ اٹھنے والے اور آویزوں کے درخشاں و تابندہ الماس وہ پیشانیوں کی محدود و مختصر فضائیں ناقابل شمار اداؤں سے گیسو کی آرائش اور ان آرائشوں کی وہ مبہوت و دیوانہ بنا دینے والی نکہت باریاں ...... یہ معلوم ہوتا تھا کہ آج یہ قلعہ زمین پر لگا کر اڑ جائے گا۔"

نیاز کی اس قسم کی رومانی تحریریں، نقاد کی ہر اشاعت میں چھپتی تھیں اور ہر حلقے میں چٹخارہ لے کر پڑھی جاتی تھیں۔ یہ دراصل نیاز کی ادبی زندگی کا شباب تھا اور ان کی شخصیت و ادبیت اس زمانے کے ادبی مذاق رکھنے والے تعلیم یافتہ افراد خصوصاً کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نوجوانوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ ملا واحدی صاحب نیاز کی اس شہرت و مقبولیت کے عینی شاہد ہیں اور (خدا ان کی عمر میں برکت دے) ابھی حیات ہیں۔ وہ نیاز صاحب کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

نیاز صاحب کی ادبیت کا آفتاب برابر بلند ہو رہا تھا۔ خاص طور سے علی گڑھ کالج کے طلبہ ان سے بے حد متاثر تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدر جمہوریہ ہند) اور کئی اور طالب علم عبدالروف (ڈپٹی کلکٹر) نور الرحمٰن (بیمہ والے) وغیرہ نیاز صاحب کے ادبی معتقد تھے اور نیاز صاحب سے ملنے کے لئے دلّی کے پھیرے کیا کرتے تھے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کو بھی اول بار میں نے نیاز صاحب کے طفیل دیکھا۔ منشی محمد الدین خلیقی، سید ظفر احسن علوی، حکیم مجیب لقائی، نیاز صاحب ہی کی وجہ سے میرے گھر کی رونق بڑھاتے تھے۔ یہ تینوں انشا پرداز تھے۔ ان تینوں کے اور نیاز صاحب کے جمع ہو جانے سے میرے گھر میں بہار اتر آتی تھی۔ ایسا معلوم ہونے لگتا تھا کہ گویا چمن میں مہکتے پھول کھل گئے"[1]

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بڑے بھائی مولانا ابوالخیر مودودی صاحب نے پہلے اپنے ایک خط میں نیاز صاحب کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا:

"جی ہاں" نیاز اور بھوپال" پر لکھنے والا ایک یہی نامرجام رہ گیا ہے کاش...... تم کو مرحوم ہوئے ایک زمانہ بیت گیا۔ ابوالاعلیٰ "بعد از خدا بزرگ" ہوگئے اور یہ نافرجام وہ "ہمہ حیرتم کہ دہقان بچہ کار کشت ما را"

ایک وہ جس نے قلم پکڑنا حضرت نیاز کی حاشیہ نشینی میں سیکھا جس نے ادبی درک نیاز صاحب کی صحبتوں سے حاصل کیا اور جس نے حضرت نیاز کو ادیب سے زیادہ

---

[1] نگار پاکستان، نیاز نمبر حصہ اول ص ۸ بابت مارچ اپریل ۱۹۶۳ء مرتبہ راقم الحروف

ایک اعلیٰ قسم کا انسان پا یا یہ اس کی بدبختی ہو گی اگر وہ امتثال فرمان سے قاصر رہے .... [1]

بعد ازاں اپنے مختصر سے مضمون میں انہوں نے اس زمانے کے نیاز فتح پوری کی تصویر الفاظ میں اس طور پر کھینچی ـــ :

"کھلتا شیام رنگ" عفت کردار سے شاداب دروشن ۔ آنکھوں میں گھنیری ذہانت و ذکاوت اور چنچل پن بھی گھنی ڈاڑھی کی خوش نما سجاوٹ اک کیف استغنا ......

اور معنویت میں تفرد ... میں کوئی رسالہ پڑھ رہا تھا شاید معارف یا نقاد، نیاز صاحب نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے چونکا یا :

کیا پڑھ رہے ہو .... "ساقی نامہ پڑھو" ابر گہر بار" پڑھو اور بات فارسی کلاسک میں چل نکلی کچھ اس قرینے سے عام ادبی مساحت جیسے شفیق مربی مدت کے بعد اپنے دست گرفتہ سے ملے اور تہ بہ تہ باتوں سے بھانپے کہ تربیت رائیگاں تو نہیں گئی اور طرحداری سے یہ ایما بھی کہ درسی کلاسک کو ایک بار پڑھ لینا کافی نہیں ذہن میں ادبی رچاؤ کے لئے مزاولت ضروری ہے ....

یہ خصوصیت کچھ میرے ہی ساتھ نہیں تھی ۔ قمر الحسن (مرحوم) سے ملاقات ہوئی ۔ ان کے ساتھ بھی یہی حسن تادیب تھا ۔ ابوالاعلیٰ سے ملاقات ہوئی تو ان کے ساتھ بھی ...

..... ہماری شامیں نیاز صاحب کی خواجہ تاشی میں گزرتی رہیں ۔ پھر نیاز صاحب نے ہمیں لکھنے پر اُبھارا ....

صرف باتیں ہی باتیں نہیں کچھ کام بھی ہونا چاہیے ۔

"تم لوگ لکھو اور پڑھ کے سنایا کرو ۔ ہر مہینے کم سے کم ایک مضمون ۔ ہم تینوں کے لئے حسب ذوق مستقل موضوع بھی مقرر کئے ۔ لکھنا اور سنانا اٹل تھا مجھے نیاز صاحب ملک الموت نظر آنے لگے ۔ لیکن زجر مشفقانہ سے مفر بھی نہ تھا گو اس کا نٹی ہی پڑتی ۔ مستعدی سے ہر مہینے صرف ابوالاعلیٰ ہی لکھتے سنتے یہ لکھنا سنانا ان میں ایسا رچا کہ لکھ کے سننے کی طرح پڑھنا ان کی عادت تحریر بن گیا" [2]

غرضیکہ ۱۹۱۳ اور ۱۹۲۰ کے درمیانی عرصہ میں نیاز صاحب کی عزت و شہرت بام عروج کو پہنچ گئی تھی ۔ کیوپڈ اور سائیکی ، جذبات بھاشا ، ایک شاعر کا انجام اور اس طرح کے متعدد رومان پڑھ

---

[1] مکتوب بنام راقم الحروف مرقومہ ۶ جولائی ۱۹۶۳ء

[2] نگار پاکستان کراچی ص ۶۵ بابت ستمبر ۱۹۶۳ء

افسانے اور کتابچے شائع ہو چکے تھے۔ ہر حلقے میں ان کی تحریریں بڑے چاؤ سے پڑھی جاتی تھیں ان کے مقالوں، افسانوں، شعر منثور اور انشائیوں کی مانگ بازار میں بڑھتی جا رہی تھی۔ مجبوراً رسالوں کے مدیر اُن کی تحریریں ہزار خوشامد سے حاصل کرتے اور ادارتی نوٹ کے ساتھ نمایاں حیثیت سے شائع کرتے تھے۔ نیاز صاحب بھی صبح شام لکھتے تھے اور رسالوں کا پیٹ بھرتے تھے لیکن ان کی زیادہ تحریریں نقاد ہی میں چھپتی تھیں۔ یہ دراصل انہیں کی انشا پردازی کا اثر تھا کہ نقاد تھوڑے ہی دنوں میں "انشائے لطیف" کا نمائندہ اور معاصر پرچوں کا حریف بن گیا۔ ان ظرکے مدیر ظفر الملک نقاد اور نقاد کی تحریروں میں اکثر کیڑے نکالتے تھے لیکن نیاز فتح پوری اور ان کے "یاران نجد"[1] بھی جن کا نقاد اور مدیر نقاد سے یارانہ تھا جواب دینے میں کم نہ تھے۔ "یاران نجد" کی محفل میں جس کا ایک گروپ فوٹو بھی مولانا نیاز فتح پوری نے "نگار" کے اولین شمارے میں دے دیا ہے مندرجہ ذیل اصحاب شامل تھے:

۱۔ مولانا نیاز فتح پوری

۲۔ شاہ نظام الدین دلگیر

۳۔ لطیف الدین احمد (ل۔ احمد)

۴۔ نذیر احمد قریشی

۵۔ عارف حسین عارف ہسوی

۶۔ سید محمود احمد رضوی مخمور اکبر آبادی

۷۔ ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی

۸۔ محمد احمد ہاشمی

۹۔ محمد الدین خلیقی دہلوی

۱۰۔ سید حسن عابد جعفری

۱۱۔ بیدل شاہجہان پوری

۱۲۔ مانی جائسی

۱۳۔ عبدالرؤف ہسوی

۱۴۔ امام الدین امام اکبر آبادی

۱۵۔ ملک حبیب احمد

۱۶۔ مقدس

---

[1] یاران نجد کا گروپ فوٹو مطبوعہ نگار اس کتاب میں بھی شامل ہے۔

ان میں بہ حیثیت انشا پرداز نیاز فتح پوری شاہ دلگیر، عارف ہسوی، خلیقی دہلوی اور ضیا عباس ہاشمی خاص شہرت رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں میں انشا پردازی کا ایسا جادو تھا کہ ادبی معرکوں میں عموماً انہیں کی جیت ہوتی تھی لیکن حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ نقاد دو سال تین مہینے سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔

جنوری ۱۹۱۳ء میں نقاد طلوع ہوا تھا۔ مارچ ۱۹۱۵ء میں غروب ہوگیا۔ نقاد کی خاموشی سے آگرہ دلی اور بھوپال کی ادبی فضا بہت کچھ سونی ہوگئی۔ نقاد کے لکھنے والوں کی ادبی زندگی میں بھی ایک طرح کا خلا پیدا ہوگیا۔ چنانچہ ہر طرف سے نقاد کو دوبارہ جاری کرنے کا مطالبہ شروع کیا گیا۔ نقاد کے نوجوان قارئین خصوصاً طلبا و طالبات نے اس سلسلہ میں خطوط لکھے۔ نقاد کے خاص معاونین ضیا عباس ہاشمی، خلیقی دہلوی اور نیاز فتح پوری وغیرہ نے بھی شاہ دلگیر کو بہت اکسایا۔ لیکن وہ رضامند نہ ہوئے پھر بھی دلگیر کے دوستوں اور نقاد کے بہی خواہوں میں اس مسئلے پر غور و خوض ہوتا رہتا۔ جہاں مل جل کر بیٹھنے کا موقع ملتا دلگیر اور نقاد موضوع گفتگو بن جاتے۔ آخر کار خلیقی دہلوی، نیاز فتح پوری اور ضیاء عباس ہاشمی نے ایک دن بڑی سنجیدگی سے اس مسئلہ پر تبادلۂ خیال کیا۔

نیاز :۔ ضیائی (ضیا عباس ہاشمی) نقاد کے دوبارہ اجراء کی کوئی صورت نکلنی چاہیے۔

ضیائی : (ضیا عباس ہاشمی) میں خود بھی یہی چاہتا ہوں لیکن دلگیر، نقاد کے سلسلے میں اتنا نقصان اٹھا چکے ہیں کہ اب ان کی ہمت نہیں پڑتی۔

خلیقی : یہ کیوں نہ کیا جائے کہ ہم سب مل کر اپنی اپنی جیبوں سے ان کی کچھ مدد کریں اور نقاد کے خریداروں سے پیشگی سالانہ چندہ وصول کرنے کی مہم چلائیں۔

ضیائی : میں نے یہ تجویز بھی ان کے سامنے رکھ کر دیکھ لی ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اندر ہی سے کچھ بجھ سے گئے ہیں تبھی تو حرکت میں نہیں آتے۔

نیاز : یہ اندر سے بجھے بجھے رہنے کی علامت تو خطرناک ہے۔ اس سے ان کی تخلیقی قوتوں کو نقصان پہنچے گا۔

ضیائی : اسی لئے تو "نقاد" سے پہلے دلگیر کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔

نیاز : یہ تو صحیح ہے لیکن زندہ کیونکر کیا جائے۔

خلیقی : آپ کو دلگیر کے مزاج اور ان کی نفسیات کا خوب اندازہ ہے۔ آپ ہی کوئی ترکیب نکال سکتے ہیں۔

نیاز : ترکیب تو ہے اور بہت دلچسپ و مؤثر لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پر عمل کیسے کیا جائے۔

ضیائی : بتایئے تو سہی، میں عمل میں لانے کی صورت نکال لوں گا۔

نیاز : بھائی سنو فلسفہ حسن و عشق کے پردے میں جس طرح عورت سارے شاعروں، سارے ادیبوں

اور میری آپ کی کمزوری ہے اسی طرح دلگیر کی بھی، بلکہ مجھ سے آپ سے زیادہ، لہٰذا کیوں نہ کسی لڑکی سے نقاد کو زندہ کرنے کے سلسلے میں دلگیر کے نام ایک رومان پرور خط لکھوایا جائے ممکن ہے اس خط سے ان میں کچھ جھرجھری پیدا ہو۔

خلیقی: ترکیب تو بہت اچھی ہے لیکن ایسی لڑکی یا عورت کہاں ملے گی جو اس کام کو انجام دے سکے۔ اپنے دوستوں اور عزیزوں میں تو کوئی ہے نہیں اور اگر کوئی تعلیم یافتہ لڑکی مل بھی جائے تو وہ اس چکر میں کہاں پڑے گی وہ اپنے ہاتھ سے رومان پرور خط لکھنے اپنا نام خط میں ظاہر کرنے اور اس طرح خود کو اپنے خاندان کو رسوا کرنے پر آمادہ کیوں کر ہو گی؟

نیاز: یہی تو اصل مشکل ہے۔ کوئی عورت اس قسم کی مل جاتی تو میں اب تک اس کام کو کر گزرتا۔

ضیائی: بھائی آپ خود کیوں نہ کچھ دنوں کے لئے لڑکی بن جائیں۔ یوں بھی آپ کے افسانوں میں طبقہ نسواں کے جذبات کی بھرپور ترجمانی ہوتی ہے۔ کوئی شبہ تک نہ کرسکے گا کہ یہ کسی مرد کی تحریر ہے۔ یقین ہے کہ آپ کی انشا پردازی کا جادو پورا کام کرے گا اور دلگیر و نقاد دونوں زندہ ہو جائیں گے۔

نیاز: میں اس کے لئے تیار ہوں کسی لڑکی کی ضرورت نہیں۔ میں خود بائیں ہاتھ سے "قمر زمانی" کے نام سے خط لکھوں گا آپ صرف اس کا انتظام کر دیجئے کہ خطوط کے جوابات رازدارانہ منگائے جا سکیں۔

ضیائی: یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ گوالیار، بھوپال، بریلی، لکھنؤ اور دہلی جہاں کہیں سے آپ چاہیں گے میں اس کا انتظام کروا دوں گا۔

نیاز: اچھا تو یہ بات چند مخصوص دوستوں کے سوا کسی کو معلوم نہ ہو میں آج ہی دلگیر کو قمر زمانی بیگم کے نام سے ایک خط لکھتا ہوں۔

یہ ہے وہ پس منظر جس میں قمر زمانی (نیاز فتح پوری) اور شاد دلگیر کے درمیان خط و کتابت کا ایک دلچسپ سلسلہ شروع ہوا اور ایک عرصے تک جاری رہا۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ تیر ٹھیک نشانے پر جا کر لگا۔ دلگیر اور نقاد دونوں فی الواقع زندہ ہو گئے۔ قمر زمانی کے خطوط نے دلگیر کی ادبی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی۔ قمر زمانی کے اصرار پر پورے دو سال بعد دلگیر نے نقاد کو دوبارہ جاری کر دیا لیکن شرط یہ ٹھہری کہ خود قمر زمانی بھی پس پردہ رہ کر نقاد کی نگرانی اور ادارت میں دلگیر کا ہاتھ بٹائیں۔ قمر زمانی نے یہ شرط قبول کر لی۔ نقاد کی جوائنٹ ایڈیٹر بن گئیں اور دلگیر کے اصرار پر نقاد میں مضامین بھی لکھنے لگیں۔ ان کے مضامین نے علمی و ادبی حلقوں میں ایک ہل چل پیدا کر دی اور

اس خط وکتابت میں ضمناً اس دور کے بہت سے مشاہیر ادب شامل ہو گئے۔ قمر زمانی کے روپ میں نیاز فتح پوری کے یہی مکتوبات اور ان کے جواب میں دلگیر کے یہی خطوط اس وقت میرے سامنے ہیں اور قمر زمانی بیگم و شاہ دلگیر کی عشقیہ داستان کا مواد فراہم کرتے ہیں یہ خطوط ادبی لحاظ سے حد درجہ دلچسپ ہیں اور بیشتر نیاز کی تخلیق ہونے کے سبب اردو ادب وصحافت کی تاریخ میں ایک نایاب اور انمول خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس دفینہ بے بہا پر جتنا حق میرا ہے اتنا ہی ادب کے دوسرے قارئین کا۔ اس لئے اس میں اپنی طرف سے ایک لفظ کی کمی بیشی کئے بغیر اسے اگلے صفحوں میں پیش کیا جا رہا ہے۔

قمر زمانی بیگم اور مدیر نقاد کی داستانِ معاشقہ

قمر زمانی بیگم اور شاہ دلگیر کی خط وکتابت اور داستانِ معاشقہ کے سلسلے کا آغاز قمر زمانی بیگم کے خط سے ہوتا ہے۔ قمر زمانی کا پہلا خط ۳ ر نومبر ۱۹۱۶ء کا مرقومہ ہے اور دہلی سے لکھا گیا ہے۔ اس میں انہوں نے دلگیر کو کیا لکھا اس کے جواب میں ان کے اصل خط پہ نظر ڈالتے چلئے۔

پھاٹک حبش خان دہلی

۳ ر نومبر ۱۹۱۶ء

مری تقدیر میں دلگیر رہنا ہی مقدر ہے
نہ نکلی آج تک حسرت میں وہ حسرت بھرا دل ہوں

جناب اڈیٹر صاحب۔ تسلیم

آپ اس خط کو دیکھ کر کہیں گے کہ یہ لکھنے والی کون ہے اور یہ بدخط کس کا ہے۔ لیجئے سنئے۔ بھائی جان قبلہ کے پاس ایک عرصہ تک نقاد آتا رہا چوری چھپے میں بھی اسے دیکھ لیتی تھی۔ ماشاء اللہ کیا طرز تحریر ہے اور کیا پیارا کلام ہے۔ غزلوں کو دیکھ کر دل بے قابو ہو گیا۔ دل نے کہا ہو نہ ہو یہ کسی دکھے ہوئے جی کا کلام ہے۔ مگر حیران تھی کہ مجھ کم بخت سے بھی زیادہ کوئی دکھا ہوا دل رکھتا ہے۔ میں شاعرہ نہیں ہوں۔ لیکن تھوڑا بہت مذاقِ سخن ضرور رکھتی ہوں جو میرے تڑپانے کے لئے کافی ہے۔ شاعروں کی سخن وری کی داد دے سکتی ہوں اور نہ میں اپنی سخن فہمی کی داد چاہتی ہوں۔ عالمگیر کی چہیتی بیٹی زیب النساء کی طرح میری زندگی بھی بسر ہوتی ہے۔

خیر اس ذکر کو چھوڑیئے۔ اب آپ یہ بتایئے کہ اگر کوئی دکھیا آپ سے ملنا چاہے تو کیونکر ملے آپ بڑے آدمی ہیں۔ شاعر ہیں اور ایک مشہور شخص ہیں۔ آپ کی بلا سے مگر نہیں، اگر آپ سچ مچ ویسا ہی درد مند دل پہلو میں رکھتے ہیں جیسا کہ آپ کے کلام سے ظاہر ہے تو یقین ہے آپ ازراہ کنیز نوازی کوئی تدبیر ملاقات کی ضرور نکالیں گے۔ میری سمجھ میں تو ایک بات آئی ہے کہ آپ ۷ ر نومبر کی شب دہلی تشریف لا کر احمد بھائی ...... کے کسی بالاخانے میں قیام

کریں وہاں یا تو میں خود حاضر ہوں گی یا میری خادمہ پیاری (اس کا نام ہے) میرا خط لے کر آپ کی خدمت میں دس بجے رات کو حاضر ہوگی اور سواری ساتھ لائے گی۔ آپ اگر تشریف لاکر میری عزت بڑھائیں گے تو میں بہت شکر گذار ہوں گی۔ یہ تاریخ خاص کر اس لئے مقرر کی ہے کہ اس دن میرے عزیز و اقارب بریلی جائیں گے اور گھر میں سوائے میری خادمہ کے اور کوئی نہ ہوگا۔ نقاد میں آپ کی تصویر دیکھ چکی ہوں۔ لیکن اب سامنے بیٹھ کر آپ سے کچھ حالِ دل کہنے کو جی چاہتا ہے۔ للہ ملاقات کیجئے پھر خدا جانے کب موقع ملے کیونکہ بہت جلد بنارس جانے والی ہوں۔ (قمر زمانی)

ضیا عباس ہاشمی اور نیاز صاحب بتلایا کرتے تھے کہ شاہ دلگیر نہایت خوبرو و خوش قامت صحت مند اور وجیہہ آدمی تھے اور انہیں نقاد کی ادارت کے زمانے ہی سے یہ مغالطہ تھا کہ لڑکیاں ان کی رومان پرور انشاپردازی پر جان چھڑکتی ہیں۔ چنانچہ یہ خط ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ شاہ دلگیر خط پاتے ہی قمر زمانی سے ملنے کے لئے دہلی پہنچ گئے۔ نیاز صاحب اور ان کے حلقۂ احباب کو جب یہ معلوم ہوا کہ دلگیر صاحب واقعی تشریف لائے ہیں تو سوال یہ پیدا ہوا کہ قمر زمانی کہاں سے پیدا کی جائیں۔ آخر کار اس کے لئے بھی ایک صورت نکالی گئی۔ ضیا عباس ہاشمی کے عزیزوں میں محمد احمد (محمد احمد کا انتقال، پاکستان ہی میں ۱۹۶۴ء میں ہوا ہے) چھریرے بدن کے خوبصورت نوجوان تھے اور زنانہ لباس میں انہیں شناخت کر لینا آسان نہ تھا۔ چنانچہ محمد احمد صاحب کو قمر زمانی کے روپ میں دلگیر صاحب سے ملنے کے لئے بھیجا گیا۔ محمد احمد نے اس ڈر سے کہ کہیں راز فاش ہو جائے اپنے چہرے سے نقاب نہ اٹھایا۔ پردے ہی سے بات چیت کرتے رہے۔ دلگیر نے نقاب الٹ دینے پر اصرار کیا لیکن قمر زمانی تیار نہ ہوئیں۔ اس کا دلگیر کی طبیعت پر کچھ ناخوشگوار اثر ہوا اور وہ کچھ دیر بعد اٹھ کر چلے گئے۔ لیکن یہ ناخوشگواری لمحاتی تھی۔ واپس تو چلے گئے، لیکن قمر زمانی کے خیال کو وہ اپنے دل سے نہ نکال سکے۔ ادھر قمر زمانی بیگم نے یہ کیا کہ جس دن دلگیر دلی سے آگرہ کے لئے روانہ ہوئے اسی دن نہایت چبھتے ہوئے انداز میں مندرجہ ذیل خط ان کے نام ڈال دیا۔

۷ر نومبر ۱۹۱۶ء

وہ آئے بھی اور اٹھ کے چل بھی دیئے
یہ مدت بھی کیا مختصر ہو گئی

آداب عرض کرتی ہوں۔

خوب قدر بڑھائی اچھا ذلیل کیا۔ واہ درد مند دل والے ایسے ہی ہوتے ہیں آخر پھر تکلیف فرمانے ہی کی کیا ضرورت تھی۔ ملازم کے ہاتھ ہی کہلوا دیا ہوتا کہ ہم نہیں آ سکتے۔ میں کیا کہوں مجھے کیسی شرم آتی ہے اور میں نے کس قدر اپنے اوپر ملامت کی کاش مجھے پہلے ہی معلوم ہو جاتا کہ آپ ایسی رکھائی برتیں گے تو میں ہرگز گھر سے باہر قدم نہ رکھتی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے مجھے برقعہ اتارنے پر کیوں اس قدر مجبور کیا اور میرے انکار پر آپ کیوں بگڑ گئے اور چل دیئے۔

الٰہی توبہ آج کل کے مہذب اور تعلیم یافتہ لوگ بھی ایسے بے درد ہوتے ہیں خیر ــــ

طبیعت کو ہو گا قلق چند روز

سنبھلتے سنبھلتے سنبھل جائے گی!

میں پرسوں بریلی جا رہی ہوں اور کہہ نہیں سکتی کہ کب تک وہاں رہوں گی۔ اگر آپ کی شان کے خلاف نہ ہو تو اس پتے پر مجھے یہ تو بتلایئے گا کہ آخر بات کیا تھی پتہ یہ ہے ــــ

بانس بریلی محلہ ذخیرہ، بخدمت صادق حسین صاحب۔

لفافے کے اندر میرے نام کا خط دوسرے لفافے میں بند رکھیئے گا۔ میرے خط کے لفافے پر صرف "ق۔ ز" ہونا چاہیئے۔

آپ کی خطاوار

"قمر زمانی"

قمر زمانی کا یہ خط دلگیر کے حق میں سمندِ ناز کو ایک اور تازیانہ ہوا۔ وہ قمر زمانی کے فراق میں حد درجہ مضطرب رہنے لگے۔ حالانکہ زیادتی قمر زمانی کی طرف سے ہوئی تھی لیکن خط کا یہ اثر ہوا کہ وہ خود کو خطاوار اور قمر زمانی کو معصوم و بے قصور سمجھنے لگے چنانچہ اسی عالم اضطراب میں قمر زمانی کے خط کے جواب میں ایک طویل خط اس طور پر لکھا۔

۱۵ر نومبر ۱۹۱۶ء

کیسی معصوم بن رہی ہیں آپ

جان گویا کسی کی لی ہی نہیں

سرکار مجرا عرض ہے۔

دوسرا محبت نامہ ملا۔ شرمندہ ہوں کیا جواب دوں جس نے آپ کو ذلیل کیا خدا اُسے ذلیل کرے۔ آہ میں تو بے درد ہوں دردمند دل میرے پاس کہاں۔ ہوتا تو آپ کو شکایت ہی کیوں ہوتی۔ ہاں سچ ہے ——

اس دل سے مجھے لاگ ہے بے مہر تو میں ہوں

تم شانِ وفا جانِ وفا کانِ وفا ہو!

خدا آپ کو بایں مہر و محبت سلامت باکرامت رکھے کیا کروں اپنی کم بخت طبیعت سے مجبور ہوں ؎

"نازک مزاج میں بھی ہوں گو نازنیں نہیں"

آپ نے جس خلوص و محبت سے مجھے بلایا اور میں بدنصیب چلا آیا۔ اس کے شایانِ شان وہ حجاب نہ تھا جو برتا گیا۔ آپ کو بے تکلف ہو کر ملنا تھا کیونکہ دو ٹوٹے ہوئے دلوں میں کوئی بیگانگی اور پردہ نہیں ہوتا۔ میں ایسا بدنظر بھی نہیں تھا کہ کوئی گستاخی مجھ سے حسن کی سرکار میں سرزد ہوتی پھر ——

مشتاق سے شرم ایسی عاشق سے حجاب ایسا

اس لئے میں نے آپ سے باادب عرض کیا تھا کہ یہ حجاب باقی نہ رکھئے جو میری بدقسمتی سے قبول نہ ہوا اور میری التجا، شاہانہ لب و لہجہ میں نامنظور کر دی گئی۔ ٹھکرا دی گئی ہائے ہے

بات کی تم نے یوں کہ کی ہی نہیں لطف کیا جب نظر ملی ہی نہیں

اس بیگانگی کا مجھ پر فوری اثر ہوا اور سمجھا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں بس یہ خیال مجھ دیوانہ سر کے لئے ہوا تھا جس نے حیف اس قدر جدائی پر مجبور کر دیا ہے سے

تر سے قسمت میں میری صورت قفل ابجد

تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

اس پر آپ نے یہ قیامت کی کہ چلتے وقت نہ آپ نے ہاتھ سے دور کہ پکڑا نہ زبان سے روکا ؎

"سمندِ ناز کو اک اور تازیانہ ہوا"

ورنہ ممکن نہ تھا کہ ایک قدم بھی میں ہل سکتا۔ میں تو مرنے کے ارادہ سے گیا تھا اور صبح تک زندہ نہ رہ سکتا، لیکن افسوس سے

کبھی یاس ہوتی نہ امید اپنی تغافل سے تیرے مگر ہو گئی!

اور کیوں نہ ہوتی جب دعوت نامہ کا زیب عنوان یہ ماتم شعر تھا ۔

میری تقدیر میں دلگیر رہنا ہی مقدر ہے
نہ نکلی آج تک حسرت میں وہ حسرت بھرا دل ہوں

اب تو خوش ہوئیں ۔

لو وہ تمہارا ہی کہا ہو گیا

آپ مہذب اور تعلیم یافتہ لوگوں کو برا کہیں اور میں شرم ناروا کو ۔ ہائے اس ظالم سے خدا سمجھے ۔

شرم ہو تیرا برا دونوں کا ارمان رہ گیا

اُف شوق دل سنانے کا کس قدر ارمان تھا لیکن معلوم ہوا یہ میری غلطی تھی سے

شوقِ دل تم سے کیا بیان کرتا
کہنے سننے کی بات تھی ہی نہیں

آپ دیکھیں تو میں دکھاتا ۔

"کس قدر جلوے تڑپتے ہیں میرے سینے میں"

اور اس وقت آپ کو میرے دردمند دل کا حال معلوم ہو سکتا ۔ اب تو میں بے درد ہوں ۔ آپ باور کریں تو میں عرض کروں کہ شوق دل سنانے سے زیادہ آپ کے درد دل سننے کا اشتیاق مجھے کشاں کشاں وطن سے لے گیا اور پھر ایسے زمانے میں جب کہ کوئی گھر سے نہیں نکلتا ۔ لیکن آہ اپنی شوریدہ طالعی کو کیا کروں ۔

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کی صحبت سے کس طرح اٹھا اور اٹھنے کے بعد کیا گذر گئی ۔ بس یہ کیفیت تھی کہ ۔

"درد کی طرح اٹھے گر پڑے آنسو کی طرح"

وہ رات آہ وہ دلگیر رات میرے لئے قیامت تھی جس بے چینی اور الم سے صبح ہوئی ہے ۔ لوح دل پر اس کا نقش ثبت ہے ۔ نہیں خبر میں کیوں کہ زندہ رہا ۔ صبح ہوتے ہی لوگوں نے دیکھا کہ ایک زندہ جنازہ ریل پہ سفر کر رہا ہے ۔

کاش میں زندہ واپس نہ آتا

کیا کہوں کس قدر مجروح اور دلگیر واپس آیا ہوں ۔ آپ کبھی دیکھیں تو دکھاؤں ۔

لاکھ زخموں پر بھی ایک گوشہ سلامت دل میں ہے
یہ جگہ کس کے لئے خالی بھری محفل میں ہے

"کس کے لئے" کی ضمیر جس طرف راجع ہوتی ہے اس کا فیصلہ آپ ہی پر منحصر ہے ؎

تمہیں پر فیصلہ ٹھہرا تمہیں کہدو خدا لگتی

میری طبیعت اور آپ کی طبیعت میں بس اتنا ہی فرق ہے۔ آپ فرماتی ہیں چند روز قلق ہونے کے بعد طبیعت سنبھل جائے گی اور مجھ وفا دوست کی طبیعت کا یہ حال ہے کہ اب حشر تک سنبھلنے والی نہیں:

آندھی کی طرح آئی طبیعت جدھر آئی

خیر، یہ تو ہذیانات محبت تھے جو بے ساختہ زبان قلم سے نکل گئے اب میں اپنی بے ادبی، دل شکنی اور گستاخی کی آپ سے باادب معافی چاہتا ہوں۔ خدا کے لئے معاف کردینا ورنہ مر جاؤں گا۔

چاہتا ہوں کہ جب تک حیات مستعار باقی ہے آپ سے خط وکتابت ترک نہ ہو فرصت ہو اور جی بھی چاہے تو کبھی کبھی یاد فرماتی رہیئے۔

آپ کا قصوروار

دل گرفتہ

(دلگیر)

اس خط کے بعد دلگیر کو آزمانے اور تڑپانے کی غرض سے قمر زمانی دانستہ خاموش ہوگئیں۔ ان کے خط مرقومہ ۵ ار نومبر کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ حربہ بھی کارآمد ثابت ہوا۔ دلگیر کو قمر زمانی کے خط کا انتظار شاق گذرنے لگا۔ روز ڈاک کا ایک پلندہ آتا بے چینی سے کھولتے لیکن مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا۔ قمر زمانی کو جس دن خط ڈالا تھا اس کے دوسرے ہی دن سے جواب کا انتظار کرنے لگے تھے۔ اس انتظار میں "صبح کرنا شام کا لانا تھا جوئے شیر کا" یہ بھی اندیشہ تھا کہ خط کہیں کسی دوسرے کے ہاتھ لگے اور ذلت کا سبب بنے اس کشمکش میں پانچ چھ دن انہوں نے کسی طرح کاٹے۔ اس کے بعد تاب انتظار نہ رہی چنانچہ انہوں نے ساتویں دن پھر قمر زمانی کو لکھا:

۲۲ر نومبر ۱۹۱۶ء

سرکار ۔

گرچہ تقدیر سے ہم آپ کے شامل نہ رہے
ایسے نظروں سے گرے خط کے بھی قابل نہ رہے

اللہ اللہ! اس قدر تغافل آپ نے ۱۵ر نومبر کے خط کو اب تک لاجواب رکھا۔ کیا وہ اسی قابل تھا۔

خدا کے لئے جواب فوراً دیجئے ورنہ مر جاؤں گا۔ اتنا معلوم ہو جائے کہ وہ خط آپ تک پہنچ گیا، تسلی ہو جائے گی۔

یہ جانتا ہوں کہ "تم" اور پاسخِ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

آپ کا
دل گرفتہ

اس خط کے جواب میں قمر زمانی نے ایک مختصر سا خط بریلی کے پتے سے ڈالا اور اس انداز سے کہ دلگیر کی بے چینی بڑھانے کا کچھ اور سامان فراہم ہو گیا، خط دیکھئے:

بریلی ۳۰ر نومبر ۱۹۱۶ء

معاف فرمائیے گا آپ کی تحریروں کا جواب میں اس وقت نہیں دے سکی۔ میں اس زمانے میں بہت بیمار ہو گئی تھی اور اب بھی بہت لقیہ ہوں، میری اس بیماری کی وجہ خود اپنے دل سے پوچھ لیجئے۔ اس وقت اس سے زائد کچھ نہیں لکھ سکتی۔ آپ کی تحریر مفصل جواب چاہتی ہے، انتظار کیجئے۔ اس سے زیادہ لکھنے کی تاب مجھ میں اس وقت نہیں ہے۔

آپ کی
"ق۔ ز"

قمر زمانی کا یہ خط غالباً دلگیر تک نہیں پہنچا۔ راستے میں کہیں گم ہو گیا۔ اس لئے کہ نیاز صاحب کا ایک خط ضیائی کے نام اس طرح کا موجود ہے۔ لیکن اس پر کوئی تاریخ نہیں ہے:

ضیائی۔ غضب ہو گیا۔ قمر زمانی کا خط دلگیر کے نام میرے پیچھے میری بھانجی نے ٹکٹ لگا کر پوسٹ کر دیا۔ اب کیا کیا جائے۔

اب ارادہ ہے کہ بھوپال سے دوسرا خط ان کے نام روانہ کیا جائے اور قیام کو ظاہر کیا جائے۔ کیا رائے ہے فوراً جواب دو۔

نیاز

گویا قمر زمانی کے نام، دلگیر کے دو خط لاجواب رہے۔ لیکن وہ، قمر زمانی کی خاموشی سے مایوس نہیں ہوئے۔ انہوں نے آٹھ دس روز انتظار کیا اس کے بعد انہیں مندرجہ ذیل خط لکھ بھیجا۔

مزارِ دل

۱۲ر دسمبر ۱۹۱۶ء

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

حضورِ اقدس، ہدیہ محبت قبول ہو

اس سے قبل دو خط ارسالِ خدمت کر چکا ہوں۔ میری بدقسمتی کہ دونوں لاجواب رہے کس سے شکایت کروں کہ خود قصوروار ہوں ؎

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

ہاں عفوِ قصور کا طالب ہوں ؎

لطف مجرم پہ یہ مانا کوئی دستور نہیں | ہاں تری بندہ نوازی سے مگر دور نہیں
تم ہو مختار، ملا دا کیے، کر دیا نہ کرو | اپنے قابو میں تو اب یہ دلِ مہجور نہیں

خدا شاہد، آپ کی خاموشی سے میری حالت تباہ ہے جس کے صرف دو ہی علاج ہیں ؎

دلدہی چارہ ہے یا ترکِ محبت لیکن
اس پہ راضی نہیں تم یہ مجھے منظور نہیں

خدا کے لئے جواب دے کر میری حالت سنبھالو۔ اتنا ہی لکھ دو کہ خطوط مل گئے جرمِ محبت معاف کر دیا گیا اور۔ اور۔

یہ بھی نہ کر سکو تو ؎

تمنا کو تم اپنی منع کردو
ہماری جان کے پیچھے پڑی ہے

بس اب "گریہ مجبور" آگے کچھ نہیں لکھنے دیتا۔ ختم کرتا ہوں مگر لطف و نگاہ مرحمت کا امیدوار ہوں۔

تری نگاہ کو اللہ دلنواز کرے۔

بدستور مہجور
"دل گرفتہ"
"دلگیر"

دلگیر کا یہ خط ۱۲ر دسمبر کا ہے۔ حالانکہ قمر زمانی نے دلگیر کے پچھلے خطوط کے جواب میں ایک مفصل خط ۹ر دسمبر کو روانہ کر دیا تھا۔ لیکن یہ خط دلگیر کو غالباً ۱۲ر دسمبر کے بعد ملا۔ قمر زمانی کا خط مکتوبہ ۹ر دسمبر دیکھتے چلئے:

بریلی
۹ر دسمبر ۱۹۱۶ء

کرتے ہیں جور و جفا، مہر و وفا کہتے ہیں
یہ بھی کیا لوگ ہیں کیا کرتے ہیں کیا کہتے ہیں

دلگیر! اے سبحان اللہ آپ دلگیر ہو کے دلنواز نہیں بنتے ہیں اور دلنوازی پہ مجھ سے شرم و حجاب کی شکایت ہے۔ کاش آپ میری جگہ ہوتے اور میں آپ سے پوچھ سکتی خیر سے

حد چاہیئے سزا میں، عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

چلئے آپ سچے میں جھوٹی۔ اقرار جرم پھر دلگیر کے سامنے۔ میں اس پہ کیوں نہ ناز کر دوں۔ آپ کی بے مہری کی شکایت اور میرے لب سے، توبہ توبہ، کیونکہ ممکن ہے۔ خوب کیا جو کچھ کیا اگر قسمت میں ملنا لکھا ہے تو پوچھوں گی اور پوچھ لوں گی کہ قصور کس کا تھا اور گناہ گار کون تھا۔ اپنی مجبوریوں کو کوستی ہوں کہ اطمینان سے خط لکھنا نہیں نصیب ہوتا۔ اول تو مجھ دل گرفتہ کے لئے میری تباہیاں ہی کچھ کم نہیں۔ اس پہ رسوائی کا خوف اور گھر بھر کا ڈر، کیونکر لکھوں، صبر کرتی ہوں۔ کبھی تو اس صبر کی داد ملے گی۔ دیکھئے کوشش کر رہی ہوں کہ آپ سے آخر دسمبر میں دلی میں ملاقات

کی صورت نکل آئے، موقع اچھا ہے۔ کانفرنس میں ہمارے یہاں کے لوگ بھی جاتے ہیں۔ اگرچہ آپ وہاں جانے سے محروم رہ جاویں گی تو پھر مجھ سے شکایت ہوگی۔ مگر قیامت تو یہ ہے کہ سوائے اس کے اور تدبیر تو سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ تشریف لایئے گا تو کنیز پر اور احسان ہوگا۔ آخر عیادت بھی تو فرض ہے۔ دیکھئے میں نے کس یقین سے سمجھ لیا کہ آپ ضرور تشریف لائیں گے ؂

تم یہاں آکر تو دیکھو ہجر میں کیا حال ہے
دل کے ہاتھوں آج سو سو حشر ہیں ٹوٹے ہوئے

ماشاء اللہ خدا نظر بد سے بچائے کیا پیاری تحریر ہے اور کیا بے ساختہ انداز ہے کیوں نہ رشک کروں مگر میں کیوں رشک کروں۔ آخر کار آپ کی قابلیت میری اپنی قابلیت نہیں ؂

مجھ میں اتنا سما کہ تو نہ رہے　　　اور پھر کوئی گفتگو نہ رہے

خیر درد ظاہر کرنے کے لئے میری قابلیت بھی بری نہیں۔ ٹوٹے پھوٹے الفاظ ہیں دیکھئے جو اثر ہو ؂

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے　　　نالہ پابندِ نے نہیں ہے

میں پھر کہتی ہوں اگر میری شرم نے آپ کو دگیر بنا دیا ہے تو بلا سے مجھ پر کچھ ہی گذرے میں حضور کے حکم کی تعمیل کروں گی اور ضرور کروں گی۔

یہاں تنہائی میں جی بہت گھبراتا ہے۔ کتابیں بھی ساتھ نہیں لا سکی۔ اگر زحمت نہ ہو تو نقاد کے سارے پرچے بھیج دیئے۔ اس پر پتہ صرف لفافے کا ہونا چاہیئے میرے نام کی ضرورت نہیں۔"

خطاوار

(ق۔ ز)

دگیر نے غالباً اسی خط کے جواب میں اپنا چوتھا خط قمر زمانی کے نام اس طور پر روانہ کیا:

لکھنو

۲۶ر دسمبر ۱۹۱۶ء

سرکار۔ تحفہ نیاز۔ آپ کا روح نامہ مجھے ۲۴ر دسمبر کو ملا تھا جس کا جواب اسی روز لکھ کر خود ڈاک میں ڈالا تھا۔ غالباً نظر کیمیا اثر سے گذرا ہوگا۔

میں کل ۵ہر دسمبر کو لکھنؤ پہنچا اور بڑے دن کی تعطیل ڈاک خانہ میں نہ ہوتی تو کل یہ خط پوسٹ کر دیتا۔ آج سب سے پہلے یہ خط لکھ رہا ہوں اور اپنے خط کے جواب کا نہایت شوق اور بے صبری سے منتظر ہوں، خدا کے لئے جلد روانہ فرمایئے۔ میں یہاں ۳۰ر دسمبر تک جواب کے انتظار میں قیام کروں گا۔

اپنا پتہ خط میں لکھ دیا ہے، اب پھر لکھتا ہوں۔ ممکن ہے میرا پہلا خط نہ ملا ہو اس لئے مختصراً پھر لکھتا ہوں کہ میں یہاں سے پہلی یا دوسری جنوری کو صرف "آستاں بوسی" کے لئے بریلی آنا چاہتا ہوں اور میں ضرور آؤں گا۔ اگر آپ چند منٹ کے لئے مجھ سے مل سکتی ہوں تو اس کی تدبیر بتایئے اور مجھے مفصل لکھئے ورنہ میں یہ کروں گا کہ بریلی حاضر ہو کے کسی جگہ مقیم رہوں اور آپ کے بھائی صاحب سے ملنے کے لئے درِ دولت پہ آؤں اور طوافِ خانہ کر کے ناکام و نامراد لوٹ آؤں۔

اب جلانا یا مارنا صرف آپ کے اختیار میں ہے۔ اگر درِ دولت کی حاضری میں کچھ رسوائی کا اندیشہ غالب ہو تو فوراً مطلع فرمایئے ورنہ میں ضرور چوکھٹ کو سلام کرنے آؤں گا۔

"میرا پتہ

دفتر دلگداز۔ کٹرہ بزن بیگ خان لکھنؤ

معرفت مولینا عبدالحلیم صاحب شرر

بجز اشتیاق قدمبوسی اور کیا لکھوں ۔۔

منتظر جواب

آپ کا

"دل"

دلگیر نے یہ خط لکھنؤ سے پوسٹ کیا تھا۔ دو تین دن جواب کا انتظار کیا۔ آخر کار قمر زمانی سے ملنے کے لئے لکھنؤ سے بے تابانہ بریلی کو روانہ ہوئے اور وہاں پہنچتے ہی قمر زمانی بیگم کو خط میں لکھا:

۲ر جنوری ۱۹۱۷ء

چھانتا ہوں کو بکو کی خاک اس امید میں

کوئی ہنس دیتا میرا حال پریشان دیکھ کر

حضور ـ

وطن چھوڑا، لکھنؤ آیا۔ لکھنؤ سے ٹھوکریں کھاتے کھاتے یہاں تک پہنچ گیا ہوں :

؎ آگے تقدیر کی رسائی ہے

ہائے آپ نے یہ کیا ستم کیا کہ میرے دونوں خطوں کو اب تک لاجواب رکھا لیکن ؎

قیامت کی کشش ہے تیرے اندازِ تغافل میں
دل ناکام ہے محوِ ادائے بے رخی اب تک

آپ کی تلاش یہاں تک لے آئی ہے ـ

ملے گا کھوج نہ کب تک یہ دیکھنا ہے ہمیں
ہم اپنی جان لٹا دیں گے جستجو کے لئے

میرے حاضر ہونے کی کیا غرض ہے آہ بس یہ ـ

تمہیں دکھانے کو لایا ہوں چاک پیراہن
تمہارا تارِ نظر چاہیئے رفو کے لئے

اگر ممکن ہو اور جی بھی چاہے تو صرف اتنی تمنا ہے ؎

کبھی تو سامنے آجاؤ نقشِ آرزو بن کر
کبھی تو امتحانِ خوبیٔ تقدیر ہو جائے

اگر ایسا کر سکو تو ؎

تصدق تم پہ جانِ عاشقِ دلگیر ہو جائے

میں اس خط کے جواب کے انتظار میں یہاں ۴ر جنوری تک ٹھہرا ہوں۔ اس پتے سے فوراً جواب دیجئے۔

"بریلی عقب کوتوالی بر مکان سید واجد حسین انسپکٹر پولیس پنشنر"

آج دس بجے دن کو صادق حسین صاحب سے ملنے حاضر ہونگا۔ خدا کرے میرے آنے کی اطلاع آپ کو فوراً ہو جائے اور میں آپ کے نازک ہاتھوں کا بنایا ہوا پان کھا سکوں۔

کل ۳ر جنوری کو دس بجے دن کے پھر حاضر ہوں گا اور اس وقت میرے آنے کی اطلاع آپ کو اس خط کے ذریعے ہو چکی ہو گی۔ اپنے ہاتھوں دلگیر ہاتھوں

کے بنائے ہوئے پان ضرور کھلا دیجئے گا۔ یاد رکھئے :

پرسوں ۹ر جنوری کو بھی اسی وقت حاضری دوں گا اور خط کا جواب اس روز تک نہ ملا (خدا ایسا نہ کرے) تو دل شکستہ و مایوس وطن واپس چلا جاؤں گا... ...... مگر......... اتنا خیال رکھئے کہ وہاں اس طرح ناکام و مراد پہنچ کر زندہ نہ رہ سکوں گا ؎

ٹکڑے ہوں گے بس جگر کے گھر کو ویران دیکھ کر

ہاں خوب یاد آیا۔ اگر ممکن ہو تو اس کا جواب کسی معتبر آدمی کے ہاتھ (دستی) بھیج دیجئے کہ جلد مل جائے۔ ورنہ خود بذریعہ ڈاک ارسال فرما کر بلا لیجئے۔

کاش آنکھوں نے جو خواب دلی میں دیکھا تھا اس کی تعبیر بریلی میں ملے آمین :

دیکھئے آتی ہے وہ کون مبارک ساعت

آپ دیکھیں گے ہمیں آپکو ہم دیکھیں گے

اس تمنا کے ساتھ آنے والا

آپ کا

"دل"

قمر زمانی نے دلگیر کے اس خط کا جواب نہ دیا پھر بھی دلگیر، اپنے پروگرام کے مطابق دوسرے دن، یار کی آستان بوسی کے لئے حاضر ہوئے لیکن قمر زمانی بیگم سے ملاقات نہ ہوئی۔ ناچار واپس ہو کر قمر زمانی کے نام ایک اور خط ڈالا :

بریلی ۳ر جنوری ۱۹۱۷ء

خسرو غریب است و گدا، افتادہ در شہر شما

باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

بندہ نواز ــــ

کل یہاں پہنچ کر مفصل خط لکھ چکا ہوں۔ یقین ہے کہ ملا ہو گا۔ خط لکھنے کے بعد در دولت پر حاضر ہوا اور آستان بوسی کے بعد واپس آیا۔ صبح بھی گیا تھا اور کئی گھنٹے بیٹھنے کے بعد ابھی جائے قیام پر واپس آیا ہوں۔ اس وقت جو دل کی حالت ہے کیا عرض کروں :

آتے ہیں ہوش کھو کے تیری جلوہ گاہ سے

ہائے اس طرح جانے سے تو نہ جاتے تو اچھا تھا۔

حضورِ یار گئے بھی تو کیا ہوا حسرت
سلام کر نہ سکے ہم سوال ہو نہ سکا

آج ہاں آج پورا یقین تھا کہ خط کا جواب مجھے مل جائے گا، لیکن نہ ملا۔ اب کہ چار بج چکے ہیں اور تیسری ڈیلیوری کا بھی وقت نکل گیا۔ میں جواب ملنے سے مایوس ہوں، آہ! کیا یہی شرطِ وفا ہے۔

براہِ کرم اس خط کو ملاحظہ فرماتے ہی فوراً جواب لکھیے کہ کل شام تک مجھ کو مل جائے اور دل پر جو کوفت اور صدمہ ہے وہ دور ہو۔

خدانخواستہ اگر کل بھی جواب اور خطوط کی رسید نہ ملی تو میں تباہ ہو جاؤں گا اور شاید میری تباہی ابھی آپ کو منظور نہ ہو۔

بہر تقدیر کل رات تک جواب کا انتظار کر کے واپس چلا جاؤں گا اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ گھر زندہ پہنچوں گا۔

کل ۴ر جنوری کو ۱۲ بجے دن کو آخری مرتبہ حاضر ہو کر اس چوکھٹ کو چوموں گا، آہ بڑی حسرت یہ ہے کہ آپ کا کوئی زبانی پیام بھی نہ ملا۔ جس کی آپ سے پوری توقع تھی کیا جس کو "دل دیا کرتے ہیں" اس کو بھول بھی جاتے ہیں۔

ظالم یہ محبت کا تو دستور نہیں۔

اور کیا لکھوں۔ بخدا دل بھر آتا ہے.........

تم پر فدا ہو جانے والا
حسرت نصیب
"دل"

قمر زمانی اس پر بھی خاموش رہیں۔ دلگیر بریلی سے دل گرفتہ واپس ہوئے لیکن روانہ ہونے سے پہلے ایک مختصر سا خط بریلی ہی سے اور لکھا نہ

۴ر جنوری ۱۹۱۷ء

کیا ہی دلگیر چلے ہیں دلِ مہجور سے ہم
آئے تھے تیری زیارت کو بہت دور سے ہم

آہ—

بے تابی سے تمام دن انتظار میں گذرا۔ پھر بھی آپ کا خط نہ ملا ؏

"تھک تھک کے گر پڑی نگہہ انتظار آج"

لو مایوس جاتے ہیں خدا حافظ، پھر نہ آئیں گے۔

اچھا رخصت اور ——— ہمیشہ کے لئے

چلتے وقت فقیروں کی یہ دُعا قبول فرمایئے ———

سلامت رہے نوجوانی کسی کی

بلا سے نہ ہو زندگی کسی کی

دنیا سے جانے والا

"بدنصیب"

دلگیر کے واپس چلے جانے کے بعد قمر زمانی نے دلگیر سے اپنی معذوریوں اور کوتاہیوں کی معافی چاہی اور ایک مفصل خط دلگیر کے نام روانہ کیا:

بریلی

۱۸ر جنوری ۱۹۱۷ء

کنیز نواز۔ عذرِ گناہ اور پھر وہ بھی میری زبان سے مجھے شرمندہ اور آپ کو اور زیادہ دلگیر بنا دے گا۔ آپ فرمایئے معذرت کروں یا نہ کروں۔ نہ کروں گی اچھا نہ کروں گی صرف مجبوریوں کا اظہار کروں گی۔

مجھے درحقیقت آپ کے سب خط مل گئے ہیں۔ ایک ...... اس "مزار دل" نے تڑپا دیا، کیا کہوں کہ یہاں کیا گذر گئی۔ اپنا نہیں میرا مزارِ دل کہیئے، یا دوسرا لکھنو کا اور نہیں وہ جو بریلی سے ہی بریلی میں بھیجے گئے تھے۔ وہی بریلی جان، میں نصیبوں پیا اپنی قسمت کو لئے رو رہی ہوں۔ کاش میں گرد راہ ہو کر قدموں سے لپٹتی۔ نثار ہوتی آنکھوں کا فرش بچھاتی۔ خدا کے لئے خفا نہ ہو جانا۔ واقعہ یہ ہے کہ لکھنو اور آگرہ کے خط مجھے اس وقت ملے جب آپ خیر سے بریلی تشریف لا چکے تھے اور مجھ بدنصیب کو خبر نہ تھی۔ آپ کے باقی خط مجھے اس دن ملے جب آپ واپس جا چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں ان تین خطوں کا جواب نہ دے سکی اور نہ آپ سے ملنے کی کوئی تدبیر نکال سکی۔ آپ کے سر کی قسم ۵ر جنوری کو آپ کے تینوں خط ایک ساتھ ملے جو بریلی سے لکھے گئے تھے۔ سر پیٹ لیا جی چاہتا تھا کہ کپڑے پھاڑ کر باہر نکل جاؤں اور اپنے

دل گرفتہ دلگیر کو جس طرح بنے منالاؤں۔ لیکن وقت نکل چکا تھا اور ہم سے روٹھ کر جانے والے جا چکے تھے۔

کام تو اور جرخ میں بگڑے ہوئے اکثر بنے
تم سے جب بن کر بگڑ جائے تو پھر کیونکر بنے

مگر نہیں میں مایوس نہیں ہوں۔ منالوں گی اور آپ من جائیں گے، ہمیں منانا آتا ہے۔

حضور قصہ یہ ہے کہ جن صاحب کے ذریعہ سے خط منگواتے ہیں وہ میرے بہت دور کے عزیز ہیں اور ان کا مکان بھی فاصلہ پر ہے۔ ان کو یقین دلا دیا تھا کہ ق۔ ز کے خطوط دراصل ایک اور خاتون کے لئے ہوتے ہیں مگر آپ نے ستم کر دیا۔ خدا جانے آپ نے ان سے کیا کہا ہوگا اور وہ کیا سمجھے ہوں گے۔

انداز جنوں کون سا ہم میں نہیں مجنوں
پہ تیری طرح عشق کو رسوا نہیں کرتے

مجھ سے ضبط و تحمل سیکھئے، خیر، بدقسمتی سے اس زمانہ میں دہلی چلی گئی تھی اور خط کا لانے والا کوئی نہ تھا۔ ممکن تھا کہ وہ ان خطوط کو کسی طرح مجھ تک پہنچا دیتے مگر ان کے اور نیز میرے ایک عزیز کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس وجہ سے وہ ان پریشانیوں میں مبتلا رہے اور نہ بھجوا سکے۔ اب فرمائیے اپنے کو کوسوں یا اپنی قسمت کو روؤں میری قسم سچ سچ کہنا کیا آپ واقعی آئے تھے۔ یہ سب سچ سہی مگر مجھے خدا جانے کیوں یقین نہیں آتا۔ ہائے اللہ کتنے ارمان تھے۔ دیکھئے میں کوشش کر رہی ہوں، بنارس یا اُجین جہاں ممکن ہوا آپ سے ملوں گی، لو اب تو من جاؤ۔ ہاں اگر تکلیف نہ ہو تو نقاد کے سارے پرچے مجھے بھجوا دیجئے۔ یہ نہ پوچھئے کہ کیوں منگواتی ہوں۔

دلگیر دلنواز کی
"دل گرفتہ ق۔ ز"

قمر زمانی کے خط کا پہنچنا تھا کہ دلگیر میں تازہ روح زندگی دوڑ گئی۔ بیدلی و مایوسی پھر ایک بار شگفتگی و امید میں بدل گئی، شکوہ شکایت، ناز و نیاز اور عذر و معذرت کے جذبات امنڈ پڑے۔ چنانچہ فوراً ایک طویل خط بذریعہ رجسٹری، قمر زمانی کے نام روانہ کیا، خط دیکھئے:

جمعہ ۲۶ر جنوری ۱۹۱۷ء

میری دل گرفتہ بہنیں، دلگیر

خدا اس دل گرفتگی اور دلگیری کو قائم رکھے کہئے آمین۔ آپ کا خط آیا میں تو سمجھا تھا کہ عمر

اب نہیں کوئی سوا موت کے آنے والا

....

یہ مصرعہ لکھتے ہی قطرات اشک کی بارش شروع ہوگئی۔ خدا جانے کیوں دل بھر آیا۔ ۱۸ر جنوری کا خط ۲۲ر جنوری کو مجھے ملا۔ اف ڈاک کا یہ ظلم "کنیز نواز" اس القاب نے مار ڈالا۔ نہیں سرکار تو میرے دل کی مالک میری جان کی مختار ہیں، کنیز ہوں آپ کے دشمن۔ خدا کے لئے ایسے الفاظ نہ لکھا کیجئے جن سے مجھے صدمہ ہو۔ یہ پڑھتے ہی واللہ میری روح لرز گئی۔ معذرت آپ کو زیبا نہ تھی۔ خوش ہوا کہ آپ نے اس سے اجتناب کیا۔ ورنہ میں کہیں کا نہ رہتا۔ ہائے میرے شرمندہ کرنے کے لئے مجھے تباہ کرنے کے لئے، صرف آپ کی مجبوریوں کا اظہار ہی کافی ہے جو آپ نے کر دیا۔

یہ پڑھ کر مسرت ہوئی کہ میرے سب خط آپ کو مل گئے۔ گو میں نہ مل سکا جس کی آرزو تھی "اپنا نہیں میرا مزارِ دل کہئے" آہ اس فقرے نے رُلادیا:

"کیا کروں میں دکھا ہوا جی ہے"

"کاش میں گردِ راہ ہو کر قدموں سے لپٹتی۔ نثار ہوتی۔ آنکھوں کا فرش بچھاتی" کیا آپ نے میرے برباد کرنے، دنیا سے کھونے کا پورا تہیہ کر لیا ہے، کیا میں محبت کے ان دلدوز تیروں کو کھا کر زندہ رہ سکتا ہوں، ہائے نہیں:

اک روز رنگ لائیں گی یہ مہربانیاں
میں جانتا ہوں، جان کے خواہاں تمہیں تو ہو

واللہ بریلی کی ساری کوفت ان جذباتِ محبت سے لبریز فقروں کو پڑھ کر جاتی رہی۔ میں اور آپ سے خفا، تمام دنیا ملنے پر بھی ممکن نہیں ــ۔

نفرت میرے لئے اکثر ظالم ثابت ہوئی ہے۔ چنانچہ دلی اور بریلی میں اس کا کرشمہ آپ نے بھی دیکھ لیا۔ "میری تقدیر میں دلگیر ہی رہنا مقدر ہے"۔ میری پریشاں حالی دلگرفتگی اور افسردہ خاطری کی داد ان فقروں سے مل گئی۔

"آپ کے سر کی قسم (قربانت شوم) جس میں ۵ر جنوری کو آپ کے تینوں خط ایک ساتھ ملے جو بریلی سے لکھے گئے تھے۔ سر پیٹ لیا۔ جی چاہتا تھا کہ کپڑے پھاڑ کر باہر چلی جاؤں اور اپنے دل گم گشتہ دلگیر کو جس طرح بنے منا لاؤں وقت نکل چکا تھا اور ہم سے روٹھ کر جانے والے جا چکے تھے"۔

مجھے اس فقرے پر مُدّۃ العمر ناز رہے گا اور اپنے دل گرفتہ وگیر کو جس طرح بنے منالاؤں۔ یوسف کا واقعہ کیا تم نے سنا نہ ہوگا" اللہ راس لائے اپنا غلام کہنا"

"اور ہم سے روٹھ کر جانے والے جاچکے تھے"

ارے تو بہ میرے لئے یہ فقرہ نہیں نشتر ہے۔ وہ بھی زہر میں بجھا ہوا جس کا زخم آپ کو کیسے دکھاؤں۔ میں بریلی سے ہرگز واپس نہ آتا، اگر مجھے یقین ہوتا کہ میرے خط آپ کو مل رہے ہیں اور آپ وہاں موجود ہیں۔ عالم یاس میں جو کچھ ہو جائے کم ہے۔ شکر کیجئے کہ آپ کے خط کا جواب دینے کے لئے اب تک زندہ رہ سکا ورنہ سب سامان ہو چکے تھے۔

زہے نصیب کہ آپ مجھے منائیں۔ لیکن میں آپ سے روٹھا ہی کب تھا، خفا ہی کب تھا۔ ہاں اپنی جان سے بیزار اور اپنے جی سے آزردہ ضرور تھا اور چاہتا تھا، آہ! کس قدر چاہتا تھا کہ تم پر، ہاں تم پر نثار ہو جاؤں، فدا ہو جاؤں اور جس قدر جلد ممکن ہو قیدِ ہستی اور قیدِ غم دونوں سے ایک ساتھ آزاد، لیکن باور فرمایئے کہ آپ کا غم اس قدر عزیز اتنا پیارا تھا کہ اسے کسی عنوان چھوڑنے کو جی نہ چاہا۔ یہ اگر مونسِ تنہائی نہ ہوتا تو جانبری معلوم۔

"تمہیں منانا آتا ہے" اس قدرت پر قربان۔ کاش اس کا موقع ملے ؎

"ناز کھینچوں، بجائے حسرتِ ناز"

یہ آپ کے سمجھنے کی بات نہیں ہے ـــ

"حضور" اس تخاطب پر نثار لیکن غلام کہنا زیادہ مناسب ہوتا۔ کیا اس کا فخر کبھی مجھے حاصل ہو سکتا ہے۔ آئندہ مجھے اپنا غلام ہی لکھا کریں۔ رنجدا جی اُٹھوں گا۔ آپ مطمئن رہیں، میں نے "ان سے" کوئی ایسی بات نہیں کہی جو موجب افشائے راز ہو۔

کبھی ہم رازِ حسن و عشق کو افشا نہیں کرتے
ادھر جا یا تو گرتے ہیں مگر دیکھا نہیں کرتے

ہاں میری پریشان حالی نے زبانِ حال سے کچھ کہہ دیا ہو تو اس کا ذمہ دار کون ہے، یقیناً میں نہیں۔ عشق میں رسوائی نہ ہو تو لطف نہیں ؎

"اس میں کیا عشق کی عزت تھی کہ رسوا نہ ہُوا"

کیا بتاؤں بریلی میں تین راتیں کس طرح گذاریں ؎

"آپ سنئے گا تو پچھتایئے گا"

خیر اس ذکر کو جانے دیجئے ۔

"مجھ سے ضبط و تحمل سیکھئے" اس مشفقانہ نصیحت کا ممنون ہوں اور کبھی صحبت نصیب ہوئی تو ضرور سیکھنے کی کوشش کروں گا ورنہ حالت ہے ؎

چارۂ دل سوائے صبر نہیں

سو وہ تیرے سوا نہیں ہوتا

ہائے ہم کم بخت عشاق کے یہاں سب کچھ ہے اگر نہیں ہے تو ضبط و تحمل ۔ یہ نسائیت کا حصہ ہے جو صرف آپ کے لئے مخصوص ہے خدا مبارک کرے یہاں تو یہ تمنا ہے ؎

خراب حال وفا کو خراب رہنے دے

"پیاری"[1] میرے لئے ہر موقعہ پر بلائے جان ثابت ہوئی ۔ دلی میں بیمار تھی بریلی میں غائب :

خدا بھلا کرے آزار دینے والوں کا

آپ مجھے کوسیئے ، میری قسمت کو روئیے ، میری بربادی کا ماتم کیجئے ؎

تیرے دشمن دل دکھائیں تیرے دشمن غم کریں

میری حالت دیکھ کر تو کیوں پریشان ہوگیا

"میری قسم (اس قسم پر مر گیا) پہ سچ سچ کہنا کیا آپ (تو لکھنا تھا) واقعی آئے تھے ، یہ سب سچ ہی مگر مجھے خدا جانے کیوں یقین نہیں آتا ۔"

"ہائے اللہ کتنے ارمان تھے"

یہ فقرے محبت کی جان ہیں ۔ اف محبت میں کس قدر پیاری بدگمانیاں ہوتی ہیں اور یہ بھی اسی قسم کی ایک بدگمانی ہے کہ میرے آنے کا یقین نہیں ۔ سچ کہا ہے ؎

عشق است و ہزار بدگمانی

"ہائے اللہ ۔ کتنے ارمان تھے ۔"

اف معاذ اللہ ۔

آپ کی قسم کھاتے ہوئے ڈرتا ہوں ، رزتا ہوں ورنہ کہہ دیتا "آپ کی قسم" اس نشتر پر بے اختیار جان دینے کو جی چاہتا ہے ۔ ہائے رکھ رکھاؤ آتا تو ہو ۔ ایک چھوٹا سا فقرہ اور عطر زندگی ۔ آپ نے سارے خط میں جوانی کا زور دکھایا ہے ڈاکٹر جگہ

---

[1] قمر زمانی کی ملازمہ کا نام ہے ۔

آپ کی نزاکت خیالی میری آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپکی (خدا جانے کیا بات ہے آپ کی تحریر سے دل پر چوٹ لگتی ہے) اور اس فقرے میں تو آپ نے بڑے بڑے نازک خیالوں کا ست کھینچ لیا۔

آپ کے نشتروں کا سوائے اس کے کہ دل میں رکھ لے اور کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ لیکن سوال یہ ہے ــــــ

کیا یہ ارمان کبھی پورے ہوں گے؟

خود ہی جواب عرض کرتا ہوں:

سہارا ڈھونڈھتا ہوں زندگی کا
جو تم چاہو تو کچھ مشکل نہیں ہے

کیا اُجین جاتے ہوئے آگرہ میں ملنا ممکن نہیں ہے ــ
پھر یہی کہوں گا "جو تم چاہو تو کچھ مشکل نہیں ہے۔"

"جہاں ممکن ہوا آپ سے ملوں گی، لو اب تو من جاؤ" کیا عرض کروں اس فقرے نے مجھ پر کیا ستم ڈھایا، ہائے ظالم ؎

ڈال کر باہیں گلے میں کر دیا پانی مجھے

سچ یہ ہے کہ آپ کا ہر فقرہ ریویو کے لئے مستقل عنوان چاہتا ہے اور میں لطف کو قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے جستہ جستہ داد دیتا رہوں گا۔

"تکلیف" کی بھی ایک ہی کہی۔ میری ساری راحتیں اور تمام خوشیاں آپ کی اس آرزو پر نثار کہ نقاد آپ کے مطالعہ میں رہے۔ لیکن میں اس کی مطلا و مذہب جلدیں (جو خاص اہتمام سے آپ ہی کے لئے تیار کرائی ہیں) بھیجوں گا نہیں، خود اپنے کانپتے ہوئے پُرشوق ہاتھوں سے نذر کروں گا (خدا وہ دن جلد لائے آمین) ــ

یہ میری تمنا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اسے آپ کو منظور کرنے میں عذر نہ ہوگا۔ ہاں ارشاد ہو تو اپنی زندگی کی تصویر آپ کا غم غلط کرنے کے لئے بذریعہ رجسٹری بھیج دوں شاید لطف دے ــ

یہاں تک تو آپ کے خط کا جواب ہوا۔ اب میری ایک بات کا آپ بھی تسکین بخش جواب دے کر بلا لیجئے اور وہ یہ ہے کہ جب آپ کو سب خطوط ۵ جنوری کو مل گئے تھے تو ان کا جواب ۱۸ جنوری کو مل گئے تھے تو ان کا جواب ۱۸ جنوری کو کیوں لکھا۔
کیا یہ خیال نہ تھا کہ کوئی تنگ آ کر جان دے دے گا، ہاں نہ تھا ــ

اچھا اب کے جواب جلد نہ دینا، خاموش ہو رہنا اور پھر تمہاری جان سے دور :
"ہم دکھا دیں گے کہ یوں مرتے ہیں" مرنے والے"
بریلی کی شب ہائے دلگیر میں چند موزوں نالے دل سے نکل گئے تھے دیکھنے کی فرصت ہو اور جی بھی چاہے تو بھیج دوں۔
دو نالے دل چاہے تو ابھی سن لو، آہ سے

ہر بات پہ روتا ہے ہر بات پہ کڑھتا ہے
یہ دل بھی عجب دل ہے یہ جی بھی عجب جی ہے

آج کل یہی حالت ہے باور نہ آئے تو آکر دیکھ لو۔
دوسرا نالہ شاید نہ سنا جائے، خیر دل تھام کے عرض کرتا ہوں :

دم جس پہ نکلتا ہے دل جس پہ تصدق ہے
وہ شکل بھی آنکھوں سے اب تک نہیں دیکھی ہے

کیا نالۂ دلگیر کی داد آپ سے چاہوں؟
"دل گیر دلنواز کی دل گرفتہ"
ہائے ترکیب الفاظ ہی تو ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کوئی دل میں چٹکیاں لے رہا ہے۔ میں ان خوبصورت اور نپے تلے الفاظ کو اگر اس طرح ترکیب دے سکتا تو سچ کہتا ہوں تین بوتلوں سے کم کا نشہ نہ ہوتا۔
ہے یہ کہ :
"لکھ جاتی ہیں جو آپ کوئی لکھ نہیں سکتا"
آخر میں ہذیانات محبت کی بادب معافی چاہتا ہوں اور تمنائے قدمبوسی کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں۔ اچھا خدا حافظ فی امان اللہ۔ جلد یاد فرمایئے گا اور مفصل ورنہ یقین کیجئے مر جاؤں گا۔

صرف تمہارا
"دل گرفتہ" "دل"

اس خط کے جواب میں بھی، قمر زمانی کی جانب سے دیر ہوئی۔ دلگیر نے دس دن تک جواب کا انتظار کیا، مزید انتظار کی تاب نہ لا سکے اور دوسرا خط قمر زمانی کو اس طور پہ روانہ کیا :
"مزار دل"
۶ر فروری ۱۹۱۷ء

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

دل لے کر بھول جانے والی۔
سلامت رہو خدا اور ستانے کی توفیق دے ـــ

یادم نمی کنی وز یادم نمی روی
عمرت دراز باد فراموش گارِ من

کیا میرا رجسٹری شدہ خط آپ کو ملا نہیں۔ نہیں ملا تو ضرور، لیکن جواب کون دے گا
اب ان کی بلا آنکھ ملاتی ہے کسی سے

پورے ایک ماہ بعد جواب دینے کی عادت ہے ایک خط ۲۴ر دسمبر کو ملا تھا دوسرا ۲۴ر جنوری کو اسلئے اب ۲۴ر فروری کو آپ کے دل آویز خط کا انتظار کرنا چاہیئے اگر عادت بدستور رہی تو مل جائے گا، ورنہ اپنی قسمت کو رولیں گے۔
لیکن آہ یہ ۱۸ دن کیسے کٹیں گے ـــ
اس خاموشیِ پیہم سے معلوم ہوتا ہے۔ آپ میری وفا کا امتحان لینا چاہتی ہیں۔ اچھا مجھے (خدا مجھے آپ سے شرمندہ نہ کرے) مگر اتنا خیال رکھئے گا

کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

یہی بے اعتنائی قائم رہی تو چند دن کا مہمان ہوں۔ سن لینا کہ کوئی بدنصیب تم پر جان نثار کر گیا۔
ایک مرتبہ پہلے بھی لکھ چکا ہوں اور اب پھر لکھتا ہوں کہ میں آپ سے کچھ نہیں چاہتا صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ سلسلۂ خط و کتابت قائم رہے اور آپ مجھے جلد جلد یاد فرماتی رہیں۔ اس کے سوا کچھ اور آرزو ہو تو کافر ـــ
آج سے ایک ہفتہ تک آپ کے جواب کا انتظار کروں گا اور جواب نہ آیا تو یقین کیجئے میں نہ ہوں گا۔ آپ کے الطاف کے بعد یہ تغافل مجھ سے برداشت نہیں ہوسکتا ہائے کیوں کر ہوسکتا ہے حق

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے

شاید پھر دل کی بھڑاس نہ نکال سکوں اور یہ خط آخری ہو۔ اس لئے وہ نالے جو برلی میں خود بخود موزوں ہوگئے۔ جی چاہتا ہے آپ تک پہنچادوں۔ میرے بعد مجھے ڈر ہے، کوئی ان کا پہنچانے والا نہ ہوگا۔ اگرچہ تمنا یہ تھی کہ آپ بعد شوق ان کو سنتیں

اور میں سنتا تا لیکن آپ کو کیا غرض کہ آہِ دلگیر سنیں اس لئے خود ہی بے حیا بن کر عرض کرتا ہوں اور یہ میرا آخری پیام ہے۔ اس کے بعد اطمینان کیجئے کوئی تکلیف نہ دوں گا:

جان کس بے قرار نے دی ہے — خون کی بوند بوند بجلی ہے!
وہ سلامت رہے قیامت تک — جان جس نے ہماری لے لی ہے
ٹوٹ جاتا ہے یہ اُمید سے آہ — نامرادوں کا جی بھی کیا جی ہے
اس طرف کیا ہے نالہ و فریاد — اس طرف کیا ہے کس مپرسی ہے
اپنا غم بھیج دو بہلنے کو!! — دل میں حسرت مری اکیلی ہے
مدتوں میرے دل کی بے تابی — تیری شوخی کے ساتھ کھیلی ہے
طے ہوئے شکر سب منازلِ عشق — دل دیا پہلے جان اب دی ہے
ان کے پیکان کو دی ہے دل میں جگہ — نوکِ نشتر جگر میں رکھ لی ہے
میرے ملنے کا اور ان کو خیال — کیفیت ایک خواب کی سی ہے
قلبِ مضطر کا حال کیوں پوچھا — غم گساری نے جان لے لی ہے
یہ نہ آتا نہ جان یوں جاتی! — خط کے آنے نے جان لے لی ہے
حال پوچھو گے تم تو رو دوں گا — کیا کروں میں دکھا ہوا جی ہے
تم بنا لو جو ہار کے قابل — اک فسردہ کلی بھی دل کی ہے
اس کو سننا پڑے گا حرف بحرف — یہ فسانہ تو آپ کا ہی ہے
دل گرفتہ ہے آگرہ دلگیر — دلستاں جاں ستاں بریلی ہے

دل چاہے تو بتا تو دیجئے کہ کون سا نالہ زیادہ پسند آیا۔ کیا جواب کا متوقع رہوں؟

آپ کا ناامیدِ زیست
"دلگیر"

یہ خط ابھی پہنچا بھی نہ تھا کہ ادھر سے قمر زمانی نے دلگیر کے پہلے خط مرقومہ ۲۶ر جنوری کے جواب میں لکھ بھیجا:

بریلی

۹ر فروری ۱۹۱۷ء

کنیز نواز نہیں بلکہ عاشق نواز (اب تو خوش ہوں)

پیامِ محبت طلا مسیحائے زماں آپ کو مجھ سے شکایت ہے کہ میں نے خط دیرسے

لکھا اور مجھے اپنی قسمت سے شکوہ کہ کیوں جلد نہ لکھ سکی۔ ہاں البتہ اپنی مجبوریوں کا کہاں تک ذکر کروں اور ذکر کروں بھی تو آپ کیا سمجھیں گے۔ اگر نالۂ شب گیر میں کوئی کشش ہے تو آپ کو سامنے بٹھا کر رو رو کر اپنا حالِ دل سناؤں گی۔ پھر دیکھوں میری مجبوریوں سے کیونکر متاثر نہیں ہوتے۔ خدا کے لئے اس طرح کی شکایت نہ کیجئے گا کہ میں نے خط کب لکھا اور کیوں دیر ہوئی۔ میں تو اسی کو غنیمت سمجھتی ہوں کہ میرے خط آپ کو اور آپ کے مجھ تک پہنچ جاتے ہیں۔ آپ کنیز نواز ہونے سے کیوں بیزار ہیں۔ کنیز بھی تو آپ ہی کی ہوں، جانِ دگیر کہوں مگر نہیں، اف ان دو لفظوں میں خدا جانے کتنے جذبات پنہاں ہیں نہ کہوں گی، اچھا نہ کہوں گی۔ خدا جانے وہ کون خوش نصیب ہوں گے جو آپ کو جانِ دگیر کہہ سکیں۔ اُف اپنی بدگمانی۔ میں تو آپ سے بدگمان ہونا نہیں چاہتی مگر کیا کروں یہ بھی محبت کا خاصہ ہے۔ اچھا نہیں میں آپ کو اپنا دگیر کہوں گی مگر میرے ہو کر رہنا۔ بے وفائی نہ کرنا ورنہ مر جاؤں گی۔ مر مٹوں گی اور جان دے دوں گی۔ میری معذرت کو شرفِ قبولیت بخشنا، میری عزت بڑھائیے۔ اپنی محبت کا صدقہ معاف کر دیجئے۔ آپ نے میری تحریر کی داد دی۔ کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہو۔ میں اگر آپ کے اندازِ تحریر کی داد دینا بھی چاہوں تو الفاظ کہاں سے لاؤں۔ یہ برجستہ فقرے یہ سلامت زبان یہ خوبصورت ترکیبیں یہ محبت سے لبریز فقرے اور پھر موزوں اشعار کا استعمال کس کس کا ذکر کروں۔ آپ ہی کے سر کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ یہ اندازِ تحریر ہی تو تھا جس نے مجھے تباہ کر دیا۔ قربان اس اندازِ سوال کے۔ مجھ سے تصویر کے متعلق پوچھا جاتا ہے ہائے اللہ میں تو مارے شرم کے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ورنہ میں اپنے ارمانوں کا کیا ذکر کروں۔ یہی جی چاہتا ہے کہ تصویر نہیں بلکہ خود صاحب تصویر کو اپنے سامنے بٹھاؤں دیکھوں اور پرستش کروں۔ آپ کو میری قسم، جانِ دگیر کی قسم بہت جلد بھیج دیجئے۔ نقاد کے لئے صبر نہیں ہو سکتا، نہیں ہو سکتا۔ آپ کو خبر ہے کہ میں کیوں اسے منگوا رہی ہوں کیا آپ کا جی نہیں چاہتا کہ تنہائی میں میرا جی بہلے اور وہ بھی دگیر کے نقاد کے ساتھ۔ فوراً بھیج دیجئے۔ مجلد کرانے کی بھی ضرورت نہیں۔ ابھی تک اوجین یا بنارس جانا بھی نہیں ہوا۔ بلا سے میں جاؤں یا نہ جاؤں آپ کو اور کچھ نہ ہوا تو دہلی ضرور بلواؤں گی۔ صبر کیجئے میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ میرے ارمان آپ سے بڑھ کر ہیں۔ مگر میری مجبوریاں تو یقیناً کہیں زیادہ ہیں۔ آپ کے نالوں کی داد تو نالوں سے دوں گی لیکن روبرو۔

اب کے آپ کی تحریر میں یہ مونوگرام کیا ہے۔ آپ کے نام کے تو حرف نہیں ہیں۔

دوسروں کے مولو گرام سے مجھے معاف رکھیئے۔

(ق ۔ ز)

قمر زمانی کے اس خط کا جواب دل گیر نے خط ملتے ہی اس انداز میں دیا ــــــ :

ارض تاج

۱۲ر فروری ۱۹۱۷ء

جانِ دل گیر

میں یہ القاب لکھتے ہوئے ڈرتا تھا۔ مگر اب آپ ہی نے تجویز فرما دیا تو آئندہ یہی لکھا کروں گا۔ قربان جاؤں اس سے پیارا اور دلفریب القاب آپ کے لئے ہو نہیں سکتا۔ یہ معلوم ہوتا ہے میری روح ان دو لفظوں میں کھنچ کر آگئی ہے۔ خدا کرے آپ ہی "جانِ دل گیر" ثابت ہوں۔ وقت پر مسیحا نامہ ملا۔ جی اٹھا ورنہ دو دن بعد کچھ نہ تھا ؎

زہر بھی پیس کر رکھ چھوڑا تھا کھانے کے لئے

شکریہ ادا کر کے اس احسان کو بے وقعت نہیں کرنا چاہیئے ؎

عاشق نواز، دلگیر نواز میں ہوں یا تم
تمہیں پہ فیصلہ ٹھہرا تمہیں کہہ دو خدا لگتی

آپ کا خط دیر سے پہنچنے کی اب کبھی شکایت نہ کروں گا۔ چاہے اس کے انتظار میں دم ہی کیوں نہ نکل جائے ؏

جس میں تم خوش ہو جو تمہاری خوشی

کنیز نوازی کے ذکر میں "اب کے انڈر لائن کرنے نے مار ڈالا۔ اُف یہ بے پناہ تیر نہ کہو۔ اچھا نہ کہو۔ لیکن بد گمانی بھی نہ کرو۔" جان دلگیر" کہنے والی کوئی ہستی دنیا میں ہوتی تو میں دل گیر نہ ہوتا.................. ہائے ؎

تاریخ محبت کا فسانہ ہے یہ مصرعہ
دلگیر ہوا جب سے کہیں دل نہیں رکھتا

صدقے اس تخاطب کے آپ مجھے اپنا دلگیر کہئے۔ ہزار بار کہئے ؏

اللہ راس لائے اپنا غلام کہنا

"ہائے یہ کیا کہا" "مگر میرے ہو کر رہنا۔ بے وفائی نہ کرنا" ہیچ کہتا ہوں اس فقرے نے مجھے بہت صدمہ دیا۔ کیا میری محبت کا یہی انعام ہے۔

بیوفائی خمیر میں ہوتی تو آج دلگیر نہ ہوتے۔ خیر، اس بے وفائی کا حال عنقریب آپ

کو معلوم ہو جائے گا :

یاد آئے گی تمہیں میری وفا میرے بعد

" ورنہ مر جاؤں گی ۔ مر مٹوں گی اور جان دے دوں گی "

ہائے یہ تینوں نشتر دل میں اتر گئے ۔ خدا ہی ہے جو اب جان بچے ۔ میں آپ کو معاف کر دوں گناہ گار نہ بنایئے کہ بخشا نہ جاؤں میں آپ سے اپنی خطاؤں کی باادب معافی چاہتا ہوں ۔

" اپنی محبت کا صدقہ معاف کر دیجئے ۔ "

آپ میرے دل سے نکلی ہوئی داد کو تحسین ناشناس سمجھ کر نہ قبول فرمایئے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کے زورِ قلم کا مقابلہ مجھ ناتواں سے دشوار ہے ۔ میں اکثر دفتر کے دفتر لکھتا ہوں ۔ اشعار کی بھرتی بھی اس میں ہوتی ہے ۔ لیکن سب بے کار لاحاصل محض ۔ آپ کبھی لکھتی ہیں وہ بھی مختصر اور شعر تو بہت ہی کم ۔ مگر عبارت اتنی جامع اتنی موثر اور اتنی دل نشین ہوتی ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے ۔ بلا تصنع عرض کرتا ہوں کہ آپ کا ایک سادہ فقرہ بھی شعر ہوتا ہے ، جس کی داد دینے کے لئے آپ ہی کی زبان اور آپ ہی کا سحر آفریں قلم چاہیئے اور یہیں سے اپنا مرتبہ دیکھ لیجئے ۔

اپنے نشتروں کے زخم سے انکار ہو تو میرا چھلنی دل دیکھئے اُف قادر اندازی اتنی تو ہو ۔ خط کے لئے اتنا نہ بنایئے کہ میں شرمندہ بھی نہ ہو سکوں ۔ اس آشفتہ بیان کی آپ تعریف کرتی ہیں جسے اب تک قلم ہاتھ میں لینے کی بھی تمیز نہیں ۔ ہاں آپ کے فیض قلم سے صرف اتنا سلیقہ آیا ہے کہ اوراق کے مذاق ادب کو تاڑ لیتا ہوں اور بس ۔ بہر حال مجھ ہیچمدان و گمنام خلائق کے لئے آپ کا یہ گراں بہا فقرہ " آپ ہی کے سر کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ یہ اندازِ تحریر ہی تو تھا جس نے مجھے تباہ کر دیا (جب تک زندہ ہوں) وجہ ناز اور سبب افتخار رہے گا ۔

وہ اپنی خوبی قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

تری نگاہ جسے آشنائے راز کرے

زندگی کی تصویر بذریعہ رجسٹری بھیجتا ہوں ۔ غلامی میں قبول فرمایئے :

" یہ صورت ہے جب کی کہ میں بھی جوان تھا "

" جانِ دلگیر کی قسم " اس ناز آفریں قسم پہ میری جان تک نثار لیکن اب یہ گوارا نہیں ہو سکتا کہ آپ دلگیر کے ہوتے نقاد کو دیکھیں ۔ میں اب نقاد سے بہت بدگمان ہو چلا ہوں ۔ بہت کھٹکنے لگا ہوں ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کم بخت پہ پیار آجائے اور غریب "

ناچار دلگیر ناشاد و نامراد ہی رہے۔ مگر آپ نے قسم اس قدر سخت لگائی کہ اب مجبور ہوں فرمایئے کس پتہ سے بھیجوں۔

یہ اس لئے پوچھتا ہوں کہ پرچے باحتیاط آپ تک پہنچ جائیں اور ضائع نہ ہوں۔

معاف کیجئے مجھے دہلی نہ بلوایئے وہاں کی رو داد سے میں بہت ڈرا ہوں۔ اس لئے دہلی نہ آؤں گا۔ میں آپ کی خاطر سے دلی اور بریلی گیا تو کیا آپ میرے لئے آگرہ نہ آئیں گی۔

آیئے جلد آگرہ آیئے، شاید وصل یہیں مقدّر ہو۔۔۔

ہائے اللہ یہ کیا لکھ گیا، کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی اور اتنا بتا دیجئے کہ بغیر آپ کے صبر کیوں کر کروں۔ ہائے۔ کچھ صبر کئے سے بن نہ آیا۔۔۔ یوں بھی تو بہت دنوں بسر کی۔ خدا نالوں کی داد دینے کا وقت جلد لائے۔ آمین۔

میں نے وہ خط قصداً بھیجا تھا جس سے یہ معلوم کرنا مقصود تھا کہ آپ کو دخلِ غیر کہاں تک پسند ہے۔ الحمد للہ کہ جواب حسب منشا ملا۔ اس اداشناسی پہ مرمٹا آئندہ ایسی غلطی نہ ہوگی۔۔۔

اچھا یہ تو فرمایئے، اگر آپ نقاد کی ادارت اپنے ہاتھ میں لے لیں تو میں مرحوم کو زندہ کرنے کا سامان کروں۔ دیکھئے کسی عنوان انکار نہ کیجئے گا ورنہ ۔۔۔

"دل ٹوٹ جائے گا کسی امیدوار کا"

صرف اس تمنا کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں کہ جواب اور رسید فوراً ارسال فرمایئے اور زیادہ منتظر نہ رکھیئے۔۔۔

آپ کا

حسرت ضمیر

"دل گیر"

یہ ۱۲ار فروری ۱۷ء کا خط ہے اور قمر زمانی کے خط مرقومہ ۹ ر فروری ۱۷ء کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ ۱۲ار فروری کے بعد دلگیر کا ایک اور خط مرقومہ ۱۹ار فروری صرف فارسی اشعار پر مشتمل اس طور پہ ملتا ہے:

۱۹ار فروری ۱۷ء بسم اللہ الرحمن الرحیم

اے صبا نکہتے از خاک در یار بیار	ببر اندوہ دل و مژدۂ دلدار بیار
نکتۂ روح فزا از دہن یار بگوئے	نامۂ خوش خبر از عالم اسرار بیار

تا معطر کنم از لطفِ نسیمِ تو مشام   شمہ از نفحات نفس یار بیار

راقم

نام من رفتہ است روزے بر لبِ جاناں بہ سہو
اہلِ دل را بوئے جاں می آید از نامم ہنوز

دلگیر کا خط قمر زمانی کو موصول ہوا یا نہیں ہم اس کا سراغ نہیں ملتا۔ اس خط کا مضمون بھی جواب طلب نہیں تھا۔ اس لئے ممکن ہے کہ قمر زمانی نے اس خط کا ذکر کرنا ضروری نہ سمجھا ہو۔ لیکن دلگیر کے ۱۲ فروری والے خط کے جواب میں قمر زمانی نے اتنا ہی مفصل خط لکھا جتنا مفصل دلگیر کا خط تھا۔ قمر زمانی کا خط دیکھئے:

بریلی ۱۹ فروری ۱۹۱۷ء

جانِ آرزو یا آرزوئے جان، اچھا دونوں سہی۔ اس وارفتگی کا برا ہو خدا جانے میں نے بے خودی میں آپ سے کیا خطاب کیا جی چاہتا تھا کہ آپ کو "جانِ قمر" لکھتی لیکن ڈرتی ہوں آپ آشفتہ حال کی جان بن کر کیا کریں گے آہ! وہ جان جو ہر وقت مبتلائے رنج و ملال ہے ؎

تو ہماری زندگی، پر زندگی کیا امید
تو ہماری جان لیکن کیا بھروسہ جان کا

آپ تحریر فرماتے ہیں کہ جان دلگیر کہنے والی کوئی ہستی دنیا میں ہوتی تو میں دلگیر نہ ہوتا آپ کو میری قسم سچ کہئے کوئی اور ہستی بھی ایسی تھی جس کی طرف سے آپ یہ آرزو رکھتے ہیں۔ دیکھئے میں آپ کی طرف سے بدگمان ہو چلی ہوں اس کا جواب صاف دیجئے ورنہ میں بگڑ جاؤں گی واللہ نہ مانوں گی، جبھی تو میں نے لکھا تھا کہ میرے ہو کر رہنا۔ بیوفائی نہ کرنا۔ تحسین ناشناس نہیں تحسین قدرشناس سمجھ کر شکریہ ادا کرتی ہوں۔ مگر آپ کی تحسین اور میرے لئے شاید ہی کچھ معنی رکھتی ہو۔ اپنوں کے عیب بھی نہیں نظر آتے۔ ابھی تو نہیں لیکن امید کرتی ہوں کہ شاید آئندہ کمال تحسین مجھ میں یہ خوبی پیدا کر دے۔ تصویر دلگیر ملی۔ یہ نہ پوچھئے کہ اس نذرِ دلگیر سے خود دل گیر ہے میرے دل کی کیا حالت ہوئی۔ یہ آپ نے کیا لکھا کہ یہ تصویر اس وقت کی ہے جب کہ میں جوان تھا۔ کیا اب آپ جوان نہیں۔ جوانی نام ہے صرف دل میں سما جانے کا۔ آنکھوں کی راہ سے کلیجے میں اتر جانے کا، سو یہ میرے دل اور کلیجہ سے پوچھئے دیکھئے تقاضا جلد روانہ فرمائیے۔ ورنہ میں لڑوں

گی۔ پتہ وہی ہے مجھے یقیناً مل جائے گا۔

بہت اچھا دلی نہ آئیے۔ لیکن آگرہ کیوں کر آسکتی ہوں۔ خیر سے آپ جوش انشا پردازی میں ہرزہ سرائی پر بھی اتر آئے ہیں۔ شاید یہی مقدر ہو۔ چلو یہی یہ باتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔ نقاد کی دوبارہ زندگی میری محبت کی یادگار ہے۔ اس لیے اس یادگار کا واسطہ دلاتی ہوں کہ اسے ضرور جاری فرمائیے۔ اپریل کے پہلے ہفتے میں پرچے میرے ہاتھوں میں ہونے چاہئیں اور یہی امتحانِ محبت ہے۔ ایڈٹ کرنے میں آپ کے ساتھ ہوں، مجھے کچھ آئے یہ نہ آئے لیکن آپ پر اعتماد ہے سنبھال لیجئے گا۔ آپ اگر مناسب سمجھیں تو اپنے نام کے ساتھ میرے نام کا بھی اعلان کر دیجئے لیکن پتہ ظاہر نہ کیجئے گا نقاد کا پرچہ اس کے جواب کے ساتھ ساتھ آنا چاہیئے۔

کنیز

(ق۔ ز)

قمر زمانی کا یہ خط کیا تھا دلگیر کی بہت سی آرزوؤں کا مرقع تھا۔ اس خط نے دلگیر کو یقین دلا دیا کہ ان کی طرف سے قمر زمانی کی بدگمانی یا بے نیازی یا بے رخی محض ان کو کرھانے اور محبت کی آزمائش کے لئے تھی ورنہ دلگیر سے جس والہانہ محبت کا اظہار قمر زمانی نے پہلے دن کیا تھا وہ اسی طرح باقی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دلگیر کو "جانِ قمر" لکھنے کی آرزو کیوں رکھتیں اور ان کی خوشنودی کے لئے "نقاد" کے دوبارہ اجرا کے سلسلے میں اپنے نام کے اعلان کی اجازت کیوں دیتیں۔ نتیجتہً قمر زمانی کے اس خط نے دلگیر کی بجھی بجھی سی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ان میں کام کرنے کی نئی تڑپ اور نقاد کو پھر جاری کرنے کی نئی لگن پیدا ہوگئی۔ گویا دل کی دھڑکنوں کے ہاتھوں ذہن سے بھی کام لینے پر مجبور ہو گئے چنانچہ انہوں نے بلا تاخیر قمر زمانی کو بطور شکر و سپاس لکھ بھیجا:

ارمغ تاریخ ۲۳، فروری ۱۷ء

جانِ آرزو لکھوں یا آرزوئے جان۔

آپ نے یہ لکھ کر خطاب کا خاتمہ کر دیا۔ اب میں کیا لکھوں۔ اچھا بے خطاب سہی خدا آپ کی وارفتگی کو قائم رکھے جس سے میری دل گرفتگی و دلگیری وابستہ ہے۔ دیکھئے "جانِ قمر" لکھنے کی عزت کب حاصل ہوتی ہے۔

آشفتہ حال کی "جان" دلگیر سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے۔ آپ ہی

فرمائیے اگر میں جان تم بن سکوں تو اپنی جان تک دے دینے کے لئے تیار ہوں۔

آپ بھی جینے کے لئے راضی ہیں۔

ہائے یہ شعر ؎

تو ہماری زندگی، پر زندگی کی کیا اُمید
تو ہماری جان، لیکن کیا بھروسہ جان کا

آپ نے اس وقت لکھا جب میں ۱۹ فروری کو خط لکھنے کے بعد سے اس شعر کی پیہم تکرار کر رہا تھا اور آپ کو لکھنے والا تھا ؎

دل گیر جگر سوختہ کی جلد خبر لو
کیا ورنہ بھروسہ ہے چراغ سحری لو

اس یکسانی خیال پہ مرمٹا۔ واللہ جذب محبت اتنا تو ہو۔ میں نے وہ فقرہ اور شعر (تاریخ محبت الخ) لکھ کر اپنا راز محبت آشکارا کر دیا تھا اور کوئی بات پہلے بھی آپ سے نہیں چھپائی تھی۔ اب صاف صاف لکھتا ہوں کہ ہاں ایک سراپا تمنا ہستی تھی جواب دنیا میں نہیں ہے۔ میں اس ہستی بے نشین سے ضرور آرزو رکھتا ہوں مگر اب وہ آرزو مردہ ہے اور میں زندہ ہوں ہائے ؎

ہم ایسے بد نصیب کہ اب تک نہ مر گئے
آنکھوں کے آگے آگ لگی آشیانے میں

اس خلد آشیاں کی یاد دل میں پھانس کی طرح برابر کھٹکتی رہی اور یہ شعر اس واقعہ کی یادگار ہے ؎

دل سے جاتی ہے کہیں ناوک صیاد کی یاد
کیا مزہ ہے کہ خلش کی ہے خلش یاد کی یاد

بس اس وقت سے دلگیر ہوں لیکن خدا بھلا کرے آپ کی دلنوازی کا۔ اس دنیا میں یہ دوسرا وجود ہے جو میرے دل و دماغ پہ قبضہ کرتا معلوم ہوتا ہے۔ نہیں مجھے صاف کہنا چاہیئے کہ اس نے پوری طرح قبضہ کر لیا اور دل و جان کا مالک بن گیا۔ آپ نہ یہ دلدہی و دلجوئی کرتیں۔ نہ یہ بد نصیب دل آپ کے ہاتھوں بکتا۔ مجھے شکوہ ہے کہ کم بخت دلگیر کو جس کا پوچھنے والا کوئی نہ تھا آپ نے کیوں پوچھا، کیوں یاد کیا اور کیوں نوازا ؎

مجھ پہ احسان جو نہ کرتیں تو یہ احسان ہوتا

لیجئے میں نے اقرارِ گناہ کر لیا، جرمِ محبت کا انبالی ہوں۔ اب چاہے سزا دو یا بخش دو ے

لو کھڑے ہیں ہاتھ باندھے ہم تمہارے سامنے
کہئے اب بھی اطمینان ہوا یا بدگمان ہو

دل چیر کر دکھا دوں کہ اب اس ویرانے میں کون آباد ہے۔ ہائے تمہیں یقین نہ آئے گا (کیونکہ بدگمان ہونا بھی شانِ معشوقی ہے) ورنہ صاف کہہ دیتا ع

کہ کسے نیست بجز دردِ تو در خانہ ما

واقعی میری تحسین بے معنی ہے۔ مجھے اس کا بہ عجز اعتراف ہے جمال ہم نشیں کے مقابلے میں "کمال ہم نشین" کی دلاویز ترکیب نے مجروح کر دیا۔ خدا سلامت رکھے اور نمک چھڑک گئے۔

تصویر پر آپ نے اپنے ہاتھ سے کیا لکھا۔ مجھے بھی لکھ دیجئے کہ یاد رکھوں "جوانی نام ہے صرف دل میں سما جانے کا۔ آنکھوں کی راہ سے کلیجے میں اُتر آنے کا" آہ یہ فقرہ تیر کی طرح کلیجے میں اُتر گیا اور جس نے خراجِ تحسین کے عوض خراجِ اشک وصول کیا۔

پناہ۔ پناہ۔ موت۔ موت ۔

"ورنہ میں لڑوں گی" اف کس لطف کا فقرہ آپ نے لکھا ہے جی خوش ہو گیا حُسنِ طلب ایسا تو ہو۔ کاش میں آپ کی لڑائی دیکھنے کا فخر حاصل کر سکتا لیکن افسوس ایسی قسمت کہاں ۔

اگر میں ہرزہ سرائی دایک مرتبہ اور اپنے پیارے منہ سے یہی الفاظ کہہ دو جن کو سن کر بے اختیار منہ ..... کو جی چاہتا ہے) نہ کرتا تو یہ مزے کا فقرہ کیسے سننے میں آتا۔

"چلو ہٹو ہمیں یہ باتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں"

ہائے ظالم مار ڈالا۔ کس ادا سے کہا ہے۔ تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی عالمِ خیال میں حدِ شرع بھی جاری نہیں ہوتی۔ چونکہ وہ ایک خیالی اور فرضی تھی اس لئے اپنی گستاخی و بے ادبی کی معافی نہیں چاہتا ہے

گر من آلودہ دامنم چہ عجب
ہمہ عالم گواہ عصمت اوست

مطمئن رہیئے، آپ کی محبت کی یادگار "نقاد" اپریل کے پہلے ہفتے میں آپ کے دستِ مبارک میں ہوگا۔ میں ہر قربانی کے لئے تیار ہوں لیکن "امتحانِ محبت" میں اترا تو انعام کیا ملے گا۔ ابھی سے فیصلہ فرما دیجئے۔

خوش ہوں کہ آپ نے اس کی ادارت منظور فرمالی۔ اب پہلے پرچے کے لئے "افتتاحیہ" لو ایسی مرحمت فرمایئے کہ آپ ہی کے نام مبارک سے بسم اللہ کی جائے سے

ہائے اس نامہ کی خوش عنوانیاں
ابتدا ہو جس کی تیرے نام سے

"لوح پر آپ کا نام کس طرح اور کس عنوان سے ظاہر کروں۔ صاف صاف لکھئے اور جلد"

میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اب "نقاد" صرف آپ ہی کے نام سے موسوم ہے کہ اس میں چار چاند لگ جائیں لیکن کیا پورا نام ظاہر کر دیا جائے۔ ہائے یہ مجھ سے نہ ہوگا۔

نقاد کے پرچے جواب سے پہلے پہنچیں گے جو کل ۲۲ رفروری کو آپ کا خط ملتے ہی بذریعہ رجسٹری ارسالِ خدمت کر دیئے گئے۔ یہ تعداد میں ۲۳ ہیں صرف چار پرچے کم ہیں جو تلاش کرنے سے بھی نہیں ملے۔ تلاش ہنوز جاری ہے۔ مل جانے پر وہ بھی بھیج دیئے جائیں گے۔

اس خط کا جواب اور رسید فوراً دیجئے، تمہیں اپنی محبت کی قسم۔

غلام قمر زمانی

مندرجہ بالا خط میں "شاہ دلگیر" نقاد کو دوبارہ جاری کرنے پر رضامند نظر آرہے ہیں گویا قمر زمانی بیگم نے عاشقانہ خطوط کے ذریعہ دلگیر کو اکسانے اور نقاد کو دوبارہ جاری کرانے کے لئے جو چال چلی تھی وہ کامیاب ہو رہی ہے۔ چنانچہ قمر زمانی نے دلگیر کا خط ملتے ہی انہیں کچھ اور چھوٹ دی۔ دلگیر نے اپنے خط میں "نقاد" کے دوبارہ اجراء کے لئے یہ شرط لگائی تھی کہ قمر زمانی "نقاد" کی جوائنٹ اڈیٹر بن جائیں اور پہلے پرچے کے لئے افتتاحیہ مضمون لکھ کر بھیجیں۔ موصوفہ نے دلگیر کی یہ شرطیں بھی مان لیں اور دلگیر کی نفسیات کا اندازہ کرکے جلد ہی اُن کے خط کا جواب لکھ بھیجا۔ یہ خط اگرچہ مختصر ہے لیکن بہت کارگر ہے۔ خط دیکھئے:

بریلی ۳ر مارچ

آرزوئے بیدلاں

"جان قمر" بننے کے لئے اس قدر اضطراب آخر کیوں۔ اس القاب کا مستحق اب سوائے آپ کے اور کون ہو سکتا ہے۔ لیکن ڈرتی ہوں کہ میری بدبختی کا اثر کہیں آپ کی زندگی پر نہ پڑے۔ شکر ہے آج اس محبت کا اقرار کر لیا۔ جس کے کچھ بجھے ہوئے جذبات میرے اوپر صرف ہو رہے ہیں۔ میں چل بسی تو آپ کی پُرشوق نگاہیں کسی اور کو ڈھونڈیں گی۔ آخر اس محبت میں کیا دھرا ہے۔ کیوں آپ میری مٹی خراب کرتے ہیں۔ آپ کو کیا ہے اور کوئی سہی آہ۔

مجھے یہ سن کر نہایت مسرت ہوئی کہ آپ محض میری خاطر سے نقاد کی اشاعت کی زحمت گوارا فرما رہے ہیں۔ کس طرح شکریہ ادا کروں۔ آپ انعام طلب کرتے ہیں۔ مجھ غریب کے پاس کیا ہے۔ ایک دل تھا سو وہ کب کا خون ہو کر آنکھوں سے بہہ گیا۔

آپ افتتاحیہ مضمون مجھ سے مانگتے ہیں۔ لیجئے حاضر ہے۔ خدا جانے آپ اپنے ناظرین سے میری معرفی کس طرح کرائیں گے۔

نقاد کے پرچوں کا میں شکریہ ادا نہیں کرتی۔ باقی پرچے بھی تلاش کیجئے مضامین اور بھی لکھ رہی ہوں۔

آپ کی

(ق۔ ز)

قمر زمانی نے دلگیر کے اصرار پر مذکورہ بالا خط کے ساتھ نقاد کے پہلے پرچے کے لئے جو مضمون بطور افتتاحیہ منسلک کیا تھا۔ وہ "نقاد" میں بطور اداریہ شائع ہو چکا ہے[1] اس افتتاحیہ کو بھی دیکھتے چلئے:

"نقاد کی زندگی کا دوسرا دور"

اور

میں !!

جب کوئی عزیز یا محبوب اپنے سے جدا ہو جاتا ہے تو رنج اس بات کا نہیں ہوتا کہ

---

[1] "نقاد" ص الف تا د بابت اپریل ۱۹۱۷ء مملوکہ راقم الحروف۔

وہ جدا ہو گیا بلکہ تکلیف کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ خدا جانے کب ملے۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ اس قدر مدت کے بعد وہ ضرور مل جائے گا تو یقیناً ہماری تکلیفیں بہت کچھ گھٹ جائیں۔

موت کا صدمہ اسی خیال سے سخت صدمہ کہلاتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے پھر کبھی نہ ملنے کے لئے ہماری چیز کو ہم سے چھین لیتی ہے۔ ذرا تنہائی میں کبھی اس پر غور کیجئے کیسی سخت وحشت ہوتی ہے۔ چونکہ موت نام ہے ایک ابدی جدائی کا۔ ایسی مفارقت کا جس کی کوئی حد نہیں۔ ایسے تسلسل سکوت کا جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا اس لئے آدمی جتنا بھی تڑپے کم ہے۔ ان عاشقوں سے پوچھو کہ اگر ان کے محبوب کسی طرح پھر زندہ ہو کر دنیا میں آجائیں تو وہ کیا کچھ نہ کریں، ماؤں سے دریافت کرو اگر ان کے لال جن کو خون جگر پلا پلا کر پالا تھا پھر ان کی خالی گود میں آجائیں تو ان کی کیا حالت ہو، اس حالت کے سامنے دیوانگی تو ہوش میں داخل ہے۔

ہم کبھی ذرا فارغ ہو کر بیٹھتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ "کیوں جی اگر فلاں شخص کسی طرح زندہ ہو کر پھر ہمیں مل جائے تو کیا ہو" یہ جانتے ہیں کہ نہیں ملے گا، یہ یقین ہے کہ وہ زندہ نہیں ہو سکتا، لیکن صرف اس خیال کا یہ اثر ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے ہم اپنی اس مسرت فکر سے مغلوب ہو جاتے ہیں اور ہماری تمنائیں یہاں تک فریب دینے لگتی ہیں کہ فوراً ذہن قدرتِ خداوندی کی طرف چلا جاتا ہے کہ "اس کے اختیار میں تو سب کچھ ہے، ممکن ہے اس وقت کی دعا ہماری سن لے" لیکن سچ تو یہ ہے کہ خدا نے اپنے قانون کو کبھی نہیں توڑا اور میں آئندہ کے لئے بھی یہی حکم لگا دیتی، اگر نقاد کی زندگی کا معجزہ میرے سامنے نہ ہوتا۔

نقاد فنا ہو چکا تھا، مٹ چکا تھا، کون کہہ سکتا تھا کہ وہ پھر زندہ ہو جائے گا کس کو یقین تھا کہ پھر اس کی صورت ہمیں نظر آئے گی، اس کے مسیحا کی کس کو خبر تھی لیکن نہیں،

اے نقاد

نہ تجھے کسی نے زندہ کیا اور نہ کسی کی مسیحائی نے اثر کیا، تو اپنے حیات کے لئے خود اپنی خاکستر کو کام میں لایا اور اب ہمارے سامنے اس طرح نغمہ زن ہے:

سچ بتا تو موسیقار تو نہیں

مجھ کو جس قدر محبت نقاد سے تھی، اس کا علم صرف حضرتِ دلگیر کو ہو سکتا ہے، یا پھر مجھے اگر خود اپنی الفت کے اندازہ کر لینے کا سلیقہ مجھ میں ہو اور اسی پر قیاس اس

صدمہ کا کم لیجیے جو نقاد کے بند ہونے سے مجھ کو پہونچ سکتا تھا۔ میں غالباً اس کے اظہار پر مجبور نہیں کی جا سکتی کہ مجھے نقاد سے کیوں محبت تھی اور اس کے لیئے میں کیوں اس قدر بے تاب تھی، لیکن آپ بغیر وجہ سنے کیوں نہ یقین کریں کہ مجھے اس سے الفت تھی اور میں اس کے لئے بے قرار بھی تھی۔

اس دورِ سکوت میں کیا کیا ہوا، کس طرح گزری، اس کو دلگیر سے سنیئے اگر وہ سُنا سکیں اور مناسب سمجھیں۔ میں تو صرف حال کو دیکھتی ہوں کہ اب وہ پھر ہماری آغوش میں ہے۔ خدا کرے مآل بھی نیک ہو۔

ناظرینِ نقاد کو غالباً یہ معلوم کر کے سخت حیرت ہوگی کہ اب اس کی ترتیب و تہذیب میں میرا ہاتھ بھی شائد ہے گو دماغ نہیں۔ لیکن کیا عرض کروں جناب دلگیر کے اصرار سے میرے انکار کو مغلوب ہونا ہی پڑا اور سچ تو یہ ہے کہ میں اس مغلوبی سے ناخوش بھی نہیں ہوں۔ ہندوستان کے حلقۂ علم و ادب میں اگر محض عورت ہونا ہی سنگین جرم نہ ہوتا شاید آپ مجھ سے اس قدر اجنبی نہ ہوتے اور اس قدر صرف میرے نام کا اظہار ہی کافی ہوتا۔ مگر اپنے ہاں کی سوسائٹی اور اصول معاشرت کی مخالفت کرنا تنہا ایک جانِ ناتواں کا کام نہ تھا، خاموش رہی۔ لیکن اب جبکہ میں نسبتاً آزاد ہوں ان بندشوں کو قطع کرتی ہوں اور آپ کے سامنے اس حیثیت سے آنا چاہتی ہوں جس حیثیت سے مجھ کو اس سے قبل آجانا چاہیئے تھا۔

میں سمجھتی ہوں کہ اس وقت قدرتاً آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہو رہے ہوں گے کہ "یہ کون ہے" "کیا ہے" اور شاید میں جواب بھی دے دیتی اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ سوسائٹی کی اخلاقی حالت اس قدر بلند ہو گئی ہے کہ وہ عورت کی ہر بات سننے کے لئے اپنے اندر کافی احساس ان ذمہ داریوں کا پاتے ہیں صرف جن کا احساس ہی ان دونوں طبقوں میں حدِ فاصل قائم کر سکتا ہے۔ میں اگر نقاد کی ترتیب میں حصہ لیتی ہوں تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مجھے مرد بننا بھی پسند ہے۔ آپ کو اپنی جنس کی قدر دیا نہ ہو مگر میں تو اپنی نسائیت پر جان دیتی ہوں اور اس لئے اگر آپ کے سوالات کو تشنہ رکھتی ہوں تو یہ میری فطرت ہے۔ خواہ آپ کی بیقراری میں اس سے اضافہ ہو یا سکون۔

اس قدر تمہید کے ساتھ اب میں اس باب کا افتتاح کرتی ہوں جو نقاد کی دوسری زندگی کا عنوان ہے اور التجا کرتی ہوں کہ خدا کے لئے اب اس کو فنا نہ

ہونے دیجئے گا کہ اب اس میں ایک نسوانی عزت بھی شامل ہے جس کی توہین شاید آپ کو گوارا نہ ہو۔ اس خطاب میں خریدارانِ نقاد بھی شامل ہیں جن کی کوشش پر اس کی زندگی کا ایک حد تک انحصار ہے اور مضامین نگار بھی جن کی اعانت پر اس کا حسن منحصر ہے۔

"قمر زمانی"

قمر زمانی کے خط اور افتتاحیہ کا پہنچنا تھا کہ دلگیر کی رگ رگ میں تازہ خون زندگی دوڑ گیا۔ نقاد کے دوبارہ اجرا پر اب وہ مجبور تھے۔ اس مجبوری میں خواہ کتنی ہی انتظامی اور مالی دشواریاں حائل کیوں نہ رہی ہوں، لیکن شاہ دلگیر کو ان دشواریوں کی مطلق پروانہ تھی صورت یہ تھی وہ قمر زمانی پر جان چھڑکتے تھے۔ ان کی خوشنودی اور رضامندی کے لئے ترستے تھے مگر قمر زمانی چھلاوا دے جاتی تھیں کسی طرح قابو میں نہ آتی تھیں۔ لیکن پچھلے خط میں انہوں نے دلگیر سے برملا محبت کا اظہار کر دیا تھا اور نقاد کے لئے افتتاحی مضمون بھیج کر ان کے ساتھ پیمانِ وفا باندھ لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک عاشق کی بڑی کامیابی تھی۔ اس نے اپنی دانست میں محبوب کا دل جیت لیا تھا اور اپنی طرح محبوبہ کو بھی اضطراب محبت میں مبتلا کر دیا تھا۔ چنانچہ شاہ دلگیر قمر زمانی کا محبت بھرا خط اور افتتاحی مضمون پا کر باغ باغ ہو گئے۔ قمر زمانی کو بھی شکر و سپاس کا خط لکھا اور اپنے خاص دوستوں کو اپنی کامیابی کی اطلاع دے دی۔ پہلے قمر زمانی کے خط کا جواب دیکھیے:

ارضِ تاج ۸ر مارچ ۱۹۱۸ء

تمنائے دلگیر

افتتاحیہ اور مسیحا نامہ ملا۔ کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ "اس قدر اضطراب کرے" ہائے انہیں اداؤں پہ جان دیتا ہوں ؎

وعدہ نہ وفا کرنا پھر اس پہ یہ تاکید یں
تا حشر ٹھہر جاؤ کیوں جان نکلتی ہے

اس انتخاب کا مستحق اب سوائے میرے اور کون ہو سکتا ہے۔ ہائے ابھی کا تو یقین نہیں۔ دل جلوں کا ایسا نصیب کہاں۔ آپ ڈریں نہیں۔ میری زندگی اگر وہ زندگی کہی جا سکے پہلے سے خراب ہے۔ خراب رہے گی اور اسے خراب ہی رہنا چاہیئے خود میری تیرہ بختی کا اثر مجھے تباہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ آہ میں کیا اور میری زندگی کیا:

"مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں"

اس کا انصاف آپ کے ہاتھ ہے کہ میری پرشوق نگاہوں نے آپ کو ڈھونڈھا یا آپ

نے مجھ کو تلاش کیا۔ میں ۱۹۸۰ء سے دلگیر ہوں۔ ۱۹ برس میں آج تک کسی پر نظر ڈالی ہو تو کافر۔ لیکن تیر اگر خود کلیجے پر آ کر پڑے تو زخمی ہونا ہی چاہیئے۔ آپ کے یہ دل دوز نشتر کھا کر مجھے احساس ہوا کہ میں دلگیر رہوں گا اور مجھے دلگیر ہی رہنا چاہیئے۔

آہ پُر حسرت نگاہیں کبھی پُر شوق نگاہیں نہیں بن سکتیں "آخر اس محبت میں دھرا کیا ہے" اسے پڑھ کر مجھے اپنی ذات سے نفرت ہوگئی۔ بے شک محبت کرنے کے قابل نہیں۔ یہ جو کچھ تھا میری ریاکاری تھا۔ معاف کیجیے۔ آئندہ یہ خطا مجھ سے نہ ہوگی۔ خدا مجھے اس دن کو نہ رکھے کہ میں اپنی مٹی خراب کروں۔ آہ یہ مٹی خراب ہونے کے لئے نہیں خراب کرنے کے لئے ہے اور اس نے خراب کر دیا۔

"آپ کو کیا اور کوئی سہی" آہ۔ اس نشتر کا زخم مدت العمر نہیں بھر سکتا۔ ہاں میں ایسا ہی ہرجائی ہوں۔ ایسا ہی فریبی۔ میری غلطی تھی، مجھے دھوکہ ہوا کہ اپنے ریاکار اور ملوث دل کو آپ کی محبت کے لائق سمجھا اور یہ نہ سمجھا کہ "عنقا را بلند است آشیانہ"

میں آپ سے اظہارِ محبت کر کے پشیمان ہوں شرمندہ ہوں اور اب چاہتا ہوں کہ آپ اسے ازراہِ محبت واپس کر دیں۔ کیونکہ آپ کو چاہنے کے لئے آپ ہی کا سا معصوم اور بے لوث دل چاہیئے۔ میرے جذبات جھوٹے ہیں، میری محبت جھوٹی ہے۔ میرا دل جھوٹا ہے اور ہرگز اس قابل نہیں کہ آپ سے محبت کر سکے۔ اس بدنصیب کی نادانی تھی کہ چھوٹا ہو کر اتنا بڑا دعویٰ کر بیٹھا جس کا وہ کسی طرح اہل نہ تھا اچھا آپ مطمئن رہیں۔ اب میں کچھ نہ چاہوں گا نہ دل، نہ انعام۔

ہائے آپ کو کیا خبر کہ یہاں تک خط میں نے کس حالت میں لکھا ہے بتانا فضول ہے، سچ کہتا ہوں باور کرو۔ اب میں اس حالت میں نہیں ہوں کہ آپ کی سعرنی جیسا جی چاہتا ہے، ناظرین نقاد سے کر سکوں۔ خدا جانے فرطِ محبت میں زبان قلم سے کیا نکل جائے جو شاید آپ کو ناگوار ہو اس لئے بہتر یہی ہے کہ آپ میری طرف سے افتتاحیہ لکھ کر فوراً ارسال کر دیں کہ دونوں ساتھ ساتھ شائع ہو جائیں۔ اسے کسرِ نفسی نہ خیال فرمایئے گا، نفس الامر یہی ہے جو عرض کر رہا ہوں۔ میرا افتتاحیہ فوراً نہ آیا تو پرچہ اپریل کے پہلے ہفتے میں شائع نہ ہو سکے گا۔ اس لئے بواپسی ڈاک مرحمت فرما کر ممنون کیجیے۔

افتتاحیہ کے متعلق میری خاموشی سے اس کی تعریف کا اندازہ کر لیجیے۔ کاش میں

ایسا لکھ سکتا۔

"ہر بات تیری فسانہ حسن"

پہلے نمبر کے لئے اپنا ایک مضمون جلد بھیج دیجئے اور عکسِ رُخ موتیوں کے دانوں میں دکھائیے تو سب سے پہلے جس کی طرف سے داد ملے گی وہ میں ہوں گا

آپ کا

"دلدادہ تحریر، دلگیر"

قمر زمانی کا جو مضمون بطور" افتتاحیہ" اوپر نقل کیا گیا ہے وہ ایک ادیب شہیر (علامہ نیاز) کی تراوشِ خامہ ہونے کے سبب زبان و ادب کا شاہکار ہے۔ دلگیر کو اس کے جواب کی فکر تھی۔ اس فکر مندی کا تذکرہ ان کے خط میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ پہلے انہوں نے قمر زمانی ہی سے اس کا جواب ان کی طرف لکھ بھیجنے کی گزارش کی اور بار بار گزارش کی لیکن قمر زمانی کسی سبب سے خاموش رہیں اور دلگیر کے مذکورہ بالا خط مرقومہ ۸؍ مارچ کا کوئی جواب نہ دیا۔ دلگیر نے تین دن جواب کا انتظار کرنے کے بعد قمر زمانی کو پھر لکھا:

۱۲؍ مارچ ۱۷ء

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

میری جان، اپنی حالت کیا عرض کروں ؎

جب سے ہوئے ہیں تیرے بیگانہ ہیں جہاں سے
اپنے خیال سے بھی ناآشنائیاں ہیں!

ہائے عجب حالت ہے۔ آپ کے خیال کے سوا کوئی مونس تنہائی نہیں، حافظ نے گویا میری زبان سے کہا ہے ؎

بر آستینِ خیال تو می دہم بوسہ
بر آستانِ وصال تو نیست دست نیاز

ذرا اس شعر کی حسرت دیکھئے گا۔ آہ، آپ کی اور میری حالت کا اندازہ اس شعر سے بخوبی ہو سکتا ہے ؎

منم آں کہ خدمت تو کنم و نمی توانم
توئی آنکہ چارہ من نہ کنی و ناتوانی

سچ کہو یہ شان بے نیازی کب تک دلگیر رکھے گی۔

نقاد کی اشاعت کے سامان کے بعد تعویق جواب سخت دل شکن ہے جلد جلد جواب لکھتے رہیئے اور میری طرف سے افتتاحیہ لکھ کر لوٹتی ڈاک بھیج دیجیے کہ کتابت میں ہرج نہ ہو اور نقاد مقررہ وقت پر شائع ہو جائے۔ آپ کا افتتاحیہ بلاک بنوا کر چھپوانے کا ارادہ ہے۔

یقین کیجیے مجھ میں لکھنے کی بالکل طاقت نہیں ہے، کل سے حرارت زیادہ ہے۔

آپ کا

"بیمار"

قمر زمانی نے دلگیر کے اس خط کا بھی جواب نہیں دیا۔ اب دلگیر کو اپنے افتتاحیہ مضمون کی اور بھی فکر ہوئی۔ انہوں نے قمر زمانی کی خاموشی سے سمجھ لیا کہ وہ ان کی طرف سے مضمون لکھ بھیجنے کی فرمائش پوری نہ کریں گی۔ اس لیے انہوں نے مجبوراً علامہ نیاز فتح پوری کو قمر زمانی کے افتتاحیہ مضمون کی نقل بھیجی اور ان سے اس کا جواب لکھ دینے کی گزارش کی۔ اتفاق سے یہ خط بھی نیاز صاحب کے پاس محفوظ تھا اس پر بھی نظر ڈالتے چلیے۔ دلگیر نے نیاز صاحب کو لکھا:

آگرہ ۱۰ مارچ ۱۷ء

"محب جلیل"

نوازش نامہ کارڈ ملا۔ اب میں اس خیال پر قائم ہوں اور خدا نے چاہا تو آخر مارچ تک نقاد آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔ لطیف صاحب کے مکان پر آپ نے اس کا جو معاوضہ طے فرمایا تھا مجھے منظور ہے۔ جب ارشاد ہو بذریعہ منی آرڈر ارسال کردوں یا مضمون آپ بذریعہ وی پی ارسال کر دیں مگر جلد، کیونکہ پہلے نمبر میں اسے ہی دینے کا ارادہ ہے۔

مانی صاحب کی نظم نہیں ملی جلد ارسال فرمائیے۔

"افتتاحیہ" نقاد کے نشاۃ ثانیہ کے لیے آگیا ہے جو بغرض ملاحظہ روانہ کرتا ہوں۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ اس کے مقابلے میں افتتاحیہ لکھ سکوں۔ اس لیے یہ کام آپ کو اور صرف آپ کو کرنا ہوگا کہ میری طرف سے افتتاحیہ لکھ دیجیے جس میں ان کی (قمر زمانی کی) تقریب ان کی (قمر زمانی کی) شان کے موافق ہو جائے واقعہ کا علم آپ کو ہے۔

میں ممنون ہوں گا اگر آپ "افتتاحیہ" جواب کے ساتھ ارسال فرمائیں گے ورنہ آخر مارچ تک پرچہ شائع نہ ہو سکے گا۔ اس کا خیال رہے۔

اگر آپ حسب منشا انتاحیہ لکھ دیں گے تو مدۃ العمر شرمندہ احسان رہوں گا۔ دیکھئے

کتنی اچھی خدمت آپ کے سپرد کی ہے۔

عارف صاحب کا خط آیا، مضامین دینے کا وعدہ ہے۔ خلیقی بھی لکھ رہے ہیں۔

رؤف کو اب لکھتا ہوں۔ آپ بھی ان کو لکھ دیجئے۔

یہ "انتاحیہ" جو بھیج رہا ہوں نقاد کی اشاعت سے پہلے کسی پر ظاہر نہ کیجئے ورنہ

لطف جاتا رہے گا۔

بے صبری سے منتظر

دلگیر

نیاز فتح پوری نے دلگیر کی فرمائش کے مطابق قمر زمانی کے انتاحیہ کی تقریب

افتتاح کا مضمون لکھ کر اسی ہفتے دلگیر کے حوالہ کر دیا۔ افتتاحی مضمون ملتے ہی

دلگیر نے قمر زمانی کی خاموشی کے باوصف ان کو پھر ایک خط لکھا اور اپنا افتتاحی مضمون بھی

بغرض ملاحظہ منسلک کر دیا۔ اصل خط یہ ہے:

۱۷ مارچ ۱۷ء

قمر دلگیر

خوش رہو۔ میرے دونوں خط اب تک لاجواب ہیں۔ میری طرف سے

انتاحیہ تو کیوں لکھتیں۔ مزاج پرسی تک نہ کی۔ اس ناخوشی کا کیا ٹھکانہ۔ خیر ؎

گو نہیں پوچھتیں وہ اپنا مزاج

ہم تو کہتے ہیں دعا کرتے ہیں

ہم ہوں نہ ہوں تم سلامت رہو۔

مرمرکے "انتاحیہ" کی تقریب کی ہے۔ گویا آپ کا منہ چڑایا ہے بغرض حک و

اصلاح بعینہ بھیجتا ہوں۔ نظر ثانی بھی نہیں کی۔ دیکھ کر جلد واپس فرمایئے دیر نہ ہو۔

پہلے نمبر کے لئے اپنا کوئی مضمون فوراً عنایت ہو کہ ضرورت ہے۔ آپ کا انتاحیہ

بلاک بننے اور چھپنے کے لئے بمبئی گیا ہوا ہے۔

نقاد دو جزو تک لکھا جا چکا ہے تیسرا جزو لکھنا باقی ہے۔ پرسوں سے چھپنا

شروع ہو جائے گا۔ حیران ہوں کہ اب کے نقاد خدا جانے کیا ہو گا۔

واللہ لوگ دیکھتے ہی مر جائیں گے۔

مختلف موقت الشیوع اخبارات میں اس مضمون کا اشتہار روانہ کر دیا گیا ہے۔

"نقاد ایک خاتون کے ہاتھ میں"

"وہ جن کی مسیحائی نے نقاد کو دوبارہ زندہ کر کے اس کی حیات ثانیہ کو خدا جانے کس رنگ میں رنگ دیا ہے۔ دنیائے علم و ادب میں یہ پہلی مثال ہے کہ ایک ادبی رسالے کو ایسا قابل ذہن اور غیر معمولی پاکیزہ مذاق ادب رکھنے والے نسوانی دماغ تہذیب و ترتیب کے لئے میسر آیا ہو آپ ایک بار دیکھ تو لیں۔"

انشاءاللہ تعالیٰ حسب وعدہ اپریل کے پہلے ہفتے میں نقاد آپ کے دست ناز میں ہوگا۔

لیکن نقاد کے نظام ہستی کو برقرار رکھنے کے لئے ضرورت ہے کہ آپ جلد جلد لکھتی رہیں اور اپنے افکار جمیلہ سے محروم نہ رکھیں۔ ورنہ اب میری موت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

مضمون بغیر اصلاح واپس کیا تو لڑوں گا، گو لڑنا نہیں آتا۔

صرف آپ کا

"دلگیر"

اس خط کے ساتھ علامہ نیاز فتح پوری کا لکھا ہوا جو افتتاحی مضمون دلگیر نے اپنے نام سے قمر زمانی کو ملاحظہ کے لئے بھیجا تھا اسے بھی دیکھتے چلیئے:

افتتاحِ افتتاحیہ

آج نقاد پورے دو سال کے بعد حاضر ہوتا ہے اور آپ ہی کو نہیں مجھے بھی حیرت ہے کہ خدایا یہ کیونکر ہوا۔ مگر میں اپنے اس عالم تحیر کا لطف کس سے بیان کروں اور میں کیسے سمجھا سکوں گا کہ دنیا میں کوئی ناقابل الفہم مسئلہ میرے لئے اس سے زیادہ پر لطف نہیں ہو سکتا۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب تو میں اس قابل بھی نہیں رہا، آپ کچھ پوچھیں اور میں جواب دے سکوں۔

لوگ کہتے ہیں نقاد بند کر دیا، غلطی کی۔ میں کہتا ہوں کہ خدا کرے میں ایسا قصور ہر صبح کر لیا کروں کہ شام سے پہلے مجھے اس کی باداش مل جائے اور ایسی غلطی ہر شام کو مجھ سے ہو جائے کہ حاصل تہذیب کے سامنے میں ہر صبح کو سر بسجود نظر آؤں۔ یہ تو دنیا کی ایک مروجہ رسم ہے کہ احسان کیا جاتا ہے اور

پھر اس کا اعتراف لطف ہوتا ہے اور اس کی پذیرائی و اقرار لیکن میرے نزدیک نوازش و کرم کی اس سے زیادہ توہین اور کوئی نہیں ہو سکتی کیونکہ میرے نزدیک سکوت اور صرف سکوت ایک ایسا بلیغ اعتراف ہے جس کی قدر دنیا کو ہو یا نہ ہو۔ لیکن احسان کرنے والا اسے سمجھ جاتا ہے۔ وہ دست کرم جو ایک گدائے نوا کی طرف بڑھتا ہے، صرف اس بات کی لرزش کو محسوس کرتا ہے جو اس کے نیچے تھر تھر کانپ رہا ہے پھر کس کو خبر ہے کہ یہ لرزش بے مائگی، یہ ارتعاش بے نوائی کیسا لٹریچر ہے اور یہ خفیف سی کپکپی کس نوع کا انداز بیان۔ اس لئے اگر آج میں ان احسانات کے اعتراف سے قاصر نظر آتا ہوں جو اس دور سکوت میں مجھ پر اور میرے ساتھ نقاد پر کئے گئے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں اپنے اخلاقی فرض سے بے خبر ہوں بلکہ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ مجھے اس احسان محبت کی حرمت منظور ہے اور میں اس اعتراف رسمی سے اس حرمت کو زائل کرنا نہیں چاہتا۔

وہ معزز خاتون صرف جن کی تحریک نقاد کے نشاۃ الثانیہ کا باعث ہوئی ہے اور جنہوں نے غایت لطف و کرم سے اس کی ترتیب و تہذیب میں حصہ لینے کا عزم جمیل فرمایا ہے کون ہیں:

میں کیا عرض کروں کہ وہ کون ہے

اور انہوں نے کیوں نقاد کو زیر بار احسان کر کے مجھ پر ایسا صریح ظلم کیا دیں اس محبت کو ظلم ہی کہوں گا۔ اس لطف کو جور ہی سے تعبیر کروں گا) ان کے افتتاحیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اس حجاب کو دور کرنا نہیں چاہتیں اور اس لئے مجھے کیا حق حاصل ہو سکتا ہے کہ میں اس پردہ کو ہاتھ لگاؤں جس کی حفاظت ایسے اچھوتے پن سے کی جاتی ہے اور رہا یہ امر کہ وہ کیا ہیں سو یہ خود ان کے افتتاحیہ اور دیگر مضامین سے ظاہر ہو جائے گا کہ وہ کیسی غیر معمولی قابلیت اور کس قدر پاکیزہ مذاق ادب، فطرت کی طرف سے لے کر آئی ہیں۔ اس لئے نقاد آج جس قدر فخر و ناز کرے کم ہے کیونکہ ہندوستان کی تاریخ جرائد و رسائل میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ کسی ایسے رسالہ کی ترتیب و تہذیب جس کا معیارِ ادب "نقاد" سا ہو ایک خاتون کے اکتسابات ذہنی کی ممنون ہے۔ اگر نقاد اپنے دورِ اول میں صرف اس بات پر اظہار تفاخر

کہ سکتا تھا کہ اس نے ادبِ لطیف کا بے نظیر نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا تو وہ اپنے دورِ ثانی میں اس امر پر بصد نازِ حق و افتخار اعلان مسرت کر سکتا ہے کہ اس نے ملک کی ایک ایسی بے مثل خاتون کی ادارت و اعانت حاصل کی جس کی تحریر کے ہر ہر جملہ کو اس لحاظ سے کہ وہ ایک عورت کی فکر و دماغ کا نتیجہ ہے خوارقِ ادب میں داخل کر سکتے ہیں۔

ایک کسان سال کے بارہ مہینوں میں اپنی زمین پر محنت کیا کرتا ہے صرف اس امید پر کہ سال کے آخیر میں کسی دن اس کو دانوں کا ایک ڈھیر مل جائے گا۔ ایک باغبان مہینوں زمین کو سیراب کیا کرتا ہے محض اس توقع پر کہ ایک صبح کو وہ درخت کو بارآور دیکھ لے۔ ایک مصنف اپنی سیکڑوں قیمتی راتیں جاگ جاگ کر کاٹ دیتا ہے صرف اس خیال سے کہ ایک دن اپنے تمام خیالات پریشان کو یکجا دیکھ سکے۔ ایک شاعر رات۔ رات بھر بےچین کروٹیں لیا کرتا ہے کہ صبح کو کوئی شعر اس کی حالتِ اضطراب کا آئینہ بن سکے۔ ایک عاشق صبح سے شام تک کوچہ جاناں کے صدقے ہوا کرتا ہے محض اس امید پر کہ شائد کبھی چلمن ہوا سے اُڑ جائے اور کوئی دور ہی سے اس کا حالِ پریشان دیکھ لے، لیکن کتنے کسان ہیں جو کامیاب ہیں، کتنے باغبان ہیں جن کی اُمیدیں بارآور ہوتی ہیں، کتنے مصنف ہیں کہ وہ اپنی آرزو میں کامیاب ہو جاتے ہیں، ان شاعروں کی تعداد کس قدر ہے جن کا اضطرابِ شبی شعر ہو جاتا ہے۔ وہ عاشق کتنے ہیں جن پر ہوا رحم کھا کر چلمن کو الٹ دیتی ہے لیکن اگر کوئی باغبان و مصنف کوئی شاعر و عاشق ایسا ہے اور پھر اس کے بعد وہ زندہ بھی رہتا ہے تو اس پر تاسف کر دکیونکہ نظامِ فطرت کی نزاکت اسے لائق خطاب نہیں سمجھتی —— پھر اگر نقاد کی اجرا سے میری تمام مساعی کا مرکزِ تمنا یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی ایک ادبی خدمت صحیح معنی میں انجام دے سکے تو پھر اس کو نشاۃ الثانیہ کی ضرورت نہیں کیونکہ اس نے نہ صرف بہترین لطائف ادبی کو ملک کے سامنے پیش کیا بلکہ اس نے ایک ہستی کو نمایاں کر دیا جس کو شاید کبھی دنیا نہ جان سکتی اگر نقاد کا وجود نہ ہوتا پھر وہ غواص جو پہلے ہی غوطہ میں ایک درِ شہوار سمندر کی تہ سے نکال لائے اس کے اطمینان و مسرت کا کیا پوچھنا۔

اس لئے حقیقتاً آپ یہ نہ خیال فرمائیں کہ میں نقاد نکال رہا ہوں یا مجھے

اب کوئی تمنا اس کے متعلق باقی ہے بلکہ اب تو یہ نقاد انہیں کا ہے جنہوں نے مجھے نقاد کیا بلکہ ساری دنیا سے بے نیاز کر دیا ہے اور اب مجھے نہ کسی صلہ کی پرواہ ہے نہ داد کی تمنا اگر آپ اس کی اشاعت میں حصہ لیں گے اور اس کو اس قابل بنا دیں گے کہ وہ کم از کم اپنے مصارف کا بار خود اُٹھا سکے تو یہ مجھ پر احسان نہ ہوگا بلکہ جنسِ لطیف پر ہوگا جس کے ایک منتخب فرد نے اس سارے طبقہ کی طرف سے اپنا نازک ہاتھ آپ کے لطف و کرم کی طرف بڑھایا ہے۔

"دلگیر"

یہ مضمون ۷ ارمارچ کے خط کے ساتھ گیا تھا۔ قمر زمانی نے اس خط کا جواب دیا تھا۔ لیکن ان کا یہ خط محفوظ نہیں رہ سکا۔ نیاز فتح پوری، ضیا عباس ہاشمی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ضیا! غضب ہو گیا۔ قمر زمانی کا خط دلگیر کے نام میرے پیچھے میری بھانجی نے ٹکٹ لگا کر پوسٹ کر دیا۔ اب کیا کیا جائے؟

اب ارادہ ہے کہ بھوپال سے دوسرا خط ان کے نام روانہ کیا جائے اور اس میں یہاں کسی خاص غرض سے آنا اور قیام کرنا ظاہر کیا جائے۔ کیا رائے ہے جواب دو۔

نیاز

نیاز نے اپنے خط میں قمر زمانی کے جس گم شدہ خط کا ذکر کیا ہے وہ دلگیر کے خط مرقومہ ۷ ارمارچ کے جواب میں ڈالا گیا تھا اور اس کے چند سطروں کا مندرجہ ذیل مضمون بھی نقاد کے لئے منسلک کر دیا گیا تھا۔

"جاندار پتی"

"ایک زرد رنگ کی خشک سی خزاں رسیدہ پتی ہوا سے اڑی اور اڑتی گئی۔ روشوں کا چکر لگاتی ہوئی گھاس پر سے گزرتی ہوئی ایک شاخ گل سے لپٹ گئی۔

ایک کلی کو اپنی آغوش میں لے لیا اور تھک کر گر پڑی مجھے کتنی حیرت ہوئی جب قریب جا کر میں نے دیکھا کہ وہ تو ایک تیتری ہے۔"

دلگیر کو پورے دو ہفتے کے انتظار کے بعد جب قمر زمانی کے خط کے ساتھ ان کا انشائیہ "جاندار پتی" موصول ہوا اور ان کی بیدلی اور مایوسی ایک بار پھر امید اور زندہ دلی میں بدل گئی چنانچہ انہوں نے انشائیہ ملتے ہی قمر زمانی کو ایک خط لکھا اور اپنے پچھلے خطوں کے لاجواب رہنے کا بھی ذکر کیا۔ ان کا اصل خط دیکھئے:

۱۸ مارچ

کیا کچھ دیا تھا خط میں ستمگر کہ پڑھتے ہی
بے چین کر دیا دلِ خانہ خراب کو

دلگیر قمر۔ خدا خوش رکھے مایوس ہو کر کل ۱۷ مارچ کو ایک لفافہ بھیجا ہے جس میں "افتتاحیہ"[1] بھی ملفوف ہے نظر کیمیا اثر سے دیکھ کر جلد واپس فرمایئے۔

آج صبح بہت بیتاب و پریشان تھا۔ خدا جانے کیوں قلب کے ٹکڑے اڑے جاتے تھے کہ اسی حالت کرب و اضطراب میں محبت نامہ ملا جس کو پڑھ کر رو دیا۔ اب تک رو رہا ہوں اور جب تک یہ خط پیش نظر رہے گا روئے جاؤں گا الاماں!

میں اور تم سے روٹھ جاؤں۔ میں اور تم سے خفا ہو جاؤں۔ تمام دنیا ملنے پر بھی ممکن نہیں۔ ارے توبہ یہ آپ نے معافی کیوں چاہی۔ توبہ کیوں کی جس میں تباہ ہو گیا۔ کھو گیا۔ کہیں کا نہ رہا۔ اس خط پہ ہاتھ جوڑتا ہوں۔ منتیں کرتا ہوں۔ قدم چھوتا ہوں لللہ اپنی لازوال محبت کا واسطہ معاف کر دو۔

مجھے اب تک سب کچھ گوارا تھا لیکن نہیں گوارا تھی تو اپنی محبت کی تحقیر، اس لئے چند فقرے جوشِ محبت میں زبان قلم سے نکل گئے جو کسی طرح لائق خطاب نہ تھے۔ آپ کی خاطر سے آج یہ تحقیر (جس پہ ہزاروں عزتیں قربان ہیں) بھی گوارا ہے۔ ہائے:

اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

اچھا اطمینان رکھیے اب نہ بگڑوں گا نہ روٹھوں گا، اپنی محبت نہ واپس لوں گا بلکہ عہد کرتا ہوں کہ آپ کے درد دکھ میں (جسے میں اپنا ہی سمجھتا ہوں) دل سے شریک ہوں گا اور ناز نہیں ناز برداری کروں گا۔ اب تو خوش ہوئیں۔ ہائے اپنا صبر برائے خدا مجھ پر نہ ڈالیئے ورنہ بے موت ہی مر جاؤں گا جو شاید آپ کو گوارا نہ ہو۔

خدا مجھے غارت کرے کہ میری وجہ سے آپ کا مضمون ناتمام رہ گیا۔ یہ بدترین حق تلفی تھی جو میں نقاد کی کر سکتا تھا۔ آہ۔ اس کی تلافی کیا کروں۔ آپ ہی بتائیں "خدا کے لئے اس قدر نہ ستایئے کہ پھر آپ کو بھی رنج ہو۔" اس فقرے کو پڑھتا

---

[1] یہ مضمون اسی عنوان سے نقاد بابت اپریل ۱۷ء کے شمارے میں قمر زمانی کے اداریتی مضمون کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

ہوں اور روتا ہوں۔ روتا ہوں اور پھر پڑھتا ہوں۔ خدا جانے اس میں کیا ہے۔
ہائے تم نے یہ فقرہ نہیں لکھا بلکہ:

کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

خدا بائیں مہر و محبت سلامت رکھے کہ دگیر کی زندگی کا سہارا اب صرف تمہیں ہو۔
جانے دیجئے مارچ کے لئے کچھ نہ لکھیے۔ اپریل کے واسطے لکھئے مگر جلد بھیج دیجئے
کیونکہ دوسرے نمبر کی کتابت بھی اسی ماہ شروع ہو جائے گی۔ دو سطر کے ٹکڑے کو
میں نے دل میں جگہ دی ہے [1] دیکھئے گا کہاں رکھا ہے۔ اس دل کے ٹکڑے پر،
جس سے آپ کے جذبات عیاں ہیں۔ دفتر کے دفتر نثار ہیں چند سطریں مگر عطرِ زندگی۔
ظالم اس میں تو نے بڑے بڑے نازک خیالوں کا ست کھینچ لیا ہے۔

نقاد کے پہلے پرچے میں بہت پاکیزہ مضامین ہیں۔ بڑی پیاری نازک خیالیاں
ہیں مگر سچ کہتا ہوں سارے نقاد میں اس جاندار ٹکڑے کا جواب نہیں ع

لوگ دیکھیں گے تو مر جائیں گے

اسے دیکھ کر میرا جی چاہتا ہے اب کبھی قلم ہاتھ میں نہ لوں۔
"ایک کلی کو اپنی آغوش میں لے لیا اور تھک کر گر پڑی"۔
آہ — اس خیال کی حسرت کوئی میرے کلیجے سے پوچھے — یا — آپ کے
— دل سے۔

پھر دل میں ہے کہ بریلی کی رنگین گلیوں کی خاک چھانوں، وہیں کہیں تھک کر گر
پڑوں اور خاک ہو جاؤں۔

لوگ اس "غبارِ رنگین" کو اٹھائیں اور دریا تک پہنچا دیں، فہو المراد ۔

میں تو انجامِ محبت کے لئے تیار ہوں
کیا کروں ہے بارِ خاطر تم کو آسانی مری

خاکسار
جان نثار۔ دگیر

---

[1] دو سطر کے ٹکڑے سے اس خط میں قمر زمانی کا وہ مضمون مراد ہے جسے "جاندار پتی" کے زیرِ عنوان دگیر نے اپنے مضمون "افتتاح افتتاحیہ" کے وسط میں شائع کیا ہے ملاحظہ ہو نقاد بابت اپریل ۱۹۱۷ء ص ۵۴۔

دگیر کا یہ خط ۱۸ر مارچ کا ہے۔ قمر زمانی نے اس کا تفصیلی جواب ایک ہفتے کے بعد اس طور پر دیا:

بریلی ۲۵ر مارچ ۱۷ء

قمر نواز۔ بڑی مصیبت یہ ہے کہ آپ کے خط بہت دیر میں ملتے ہیں جن صاحب کے ذریعہ سے خطوط ملتے ہیں وہ اکثر باہر رہتے ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ بغیر ان کے مجھے مل جایا کریں۔ آپ کا ۱۸ر کا لفافہ مجھے آج ملا ہے اور ادھر قیامت یہ ہے کہ جہاں جواب میں دیر ہوئی آپ برہم ہوتے ہیں اور مجھے الگ تکلیف ہوتی ہے کہ خط کیوں دیر سے ملا۔ آپ جواب کے منتظر ہوں گے اس لئے آپ اپنی محبت کی بنا پر انتظار تو ضرور کیا کریں لیکن خدا کے لئے تاخیر کی شکایت نہ کیا کریں کہ میرا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے اور علاج میرے بس کا نہیں ۔۔

آپ کی یہ تحریر خلاف توقع نہیں ہے۔ اس لئے میرے لئے زیادہ خوشی کی بات بھی نہیں۔ اگر آپ ایفائے محبت کا وعدہ کرتے ہیں تو بڑا کمال نہیں کیونکہ میرے نزدیک یہ لازمۂ شرافت ہے اور میرے نزدیک تو دنیا میں عہد شکنی کا وجود ہی نہیں ہے جس کو زمانہ عہد شکنی کہتا ہے، وہ فی الاصل عہد ہی نہیں ہوتا ایک عہد کا حال تو اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے۔ یعنی عہد کو عہد اسی وقت کہہ سکتے ہیں جب اس پر قائم رہنے کی طرف سے اطمینان ہو جائے۔ اس لئے میں تو اس اقرار کو بھی لغو جانتی ہوں، کہنے کی ضرورت کیا۔ انسان کے عادات و اطوار خود بتاتے ہیں دیکھئے آپ ہمیشہ خیال کو بلند رکھئے، بعض دفعہ آپ بہت سبک باتیں کرنے لگتے ہیں اور مجھے سخت ایذا ہوتی ہے پہلے تو آپ کا غصہ پھر میری تحریر پر آپ کا یہ فرمانا کہ:

"نہیں اب محبت واپس نہ لوں گا، اب میں ناز نہیں ناز برداری کروں گا"۔

خود ہی غور فرمایئے کہ یہ کیا ہے، کیسا ناز کیسی ناز برداری۔ یہ آپ کے ذہن میں خیال کہاں سے پیدا ہوا۔ میں آپ کو چاہتی ہوں اور سمجھتی ہوں کہ فرض پورا کرتی ہوں۔ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں تو یقین کیجئے یہ آپ کا فرض تھا۔ پھر اس میں یہ نمائش کیسی کس کا ناز اور کیسا نیاز؟

آپ کو معلوم ہے قوس قزح میں کتنے رنگ ہوتے ہیں، سب الگ الگ لیکن بھلا کوئی یہ تو بتا دے کہ کون رنگ کہاں سے شروع ہوا۔ آہ گھل مل جانا کوئی

فطرت سے سیکھے۔ شیر و شکر دو جدا چیزیں ہیں لیکن گھل مل جانے کے بعد دونوں کا مزہ الگ الگ معلوم ہو سکتا ہے؟ پھر اگر دودھ فخر کرے کہ لذت میری ہے یا شکر کہے کہ مزہ تو مجھ سے پیدا ہوا ہے لغو ہے اصل تو یہ ہے کہ دو مل کر ایک ہو جاتے ہیں جو وحدت ہے وہ تیری وحدت میں بھی نہیں۔ خیر یہ تو ایک افسانہ ہے نہ موقع نہ ضرورت لیکن اس قدر کہنا ضروری سمجھا کہ آپ کو میری طبیعت کا اندازہ ہو جائے آپ نے جس ٹکڑے کی اس قدر تعریف کی ہے وہ اس قابل تو نہ تھا لیکن اب آپ کی قدر نے اس کی وقعت البتہ بڑھا دی، شکریہ۔

میں اس زمانے میں بہت پریشان رہی اور اب بھی ہوں۔ تاہم مضمون ضرور لکھوں گی۔ میں پہلے خط میں بھی لکھ چکی ہوں اور اب بھی لکھتی ہوں کہ میرا قیام یہاں بہت کم رہے گا اور یہ ایک بڑی فکر ہے۔ یہاں میں زیادہ آزاد رہی۔ لیکن دہلی یا لکھنؤ جا کر میں بہت پابند ہو جاؤں گی۔ آج کل میرے متعلق ایک خاص مسئلہ پر غور ہو رہا ہے۔ لیکن اب میں کسی طرح اس کی تحریک نہیں چاہتی، آپ ہی فرمائیے کیا کروں۔ سچ ہے ایک عورت کے لئے انکار جتنا سہل ہے اسی قدر دشوار بھی ہے۔ آپ فکرمند نہ ہوں کیونکہ دنیا میں کوئی کام میرے لئے اتنا سہل نہیں جتنا کہ وہ جس کے لئے میں کوئی ارادہ کر چکی ہوں[1]

آپ کی

"قمر"

قمر زمانی نے مندرجہ بالا خط ۲۵ مارچ کا مرقومہ ہے اور دلگیر کے خط مرقومہ ۱۸ مارچ کا جواب ہے۔ ابھی قمر زمانی کا خط مرقومہ ۲۵ مارچ لکھا جا رہا تھا کہ اس سے ایک دن پہلے ۲۴ مارچ کو شدید جذبات میں ڈوبا ہوا ایک اور خط دلگیر نے قمر زمانی کو اس طور پر لکھ بھیجا:

۲۴ مارچ

پیاری قمر،

میری تباہی میں جو کسر رہ گئی تھی وہ اس خطاب نے پوری کر دی۔ اللہ تمہیں سلامت رکھے اور مجھے اس خطاب کا اہل ثابت کرے۔

میں شرمندہ ہوں کہ مجھ سے آپ کی تعریف آپ کی شان کے لائق نہ ہو سکی

---

[1] اس خط کے نیچے یہ نوٹ دیا ہوا ہے "اس خط میں دوسرے ورق کا نصف جدا کر دیا گیا تھا"

اس پر بھی آپ شرمندہ ہوں تو ظلم ہے کہ نہیں ؟

اب جو کچھ ہوا یہ مجھے سوجھی خوب ۔ اس پر میں ناز کر سکتا ہوں خوشخطی کا حال مجھ سے پوچھئے جس کی نوک پلک دل میں پیوست ہے ۔ آہ ۔

بس آپ چپ ہی رہیئے اور کر لے دیکھئے جو میرا دل چاہے۔

کل ۲۳ مارچ کو بمبئی سے بلاک کا تخمینہ لے آیا تھا جو آپ کے ملاحظہ کے لیے ارسال ہے۔

کل ہی تار دیا گیا کہ فوراً بلاک بنا کر زیادہ سے زیادہ ۱۳ تک روانہ کر دیا جائے۔ خدا کرے وقت پر بلاک بن کر آجائے، ورنہ پرچہ کی اشاعت میں خواہ مخواہ دیر ہوگی جو مجھے کسی طرح منظور نہیں۔ نقاد پریس میں ہے اور چھپ رہا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ۱۳ مارچ کو چھپ کر تیار ہو جائے گا اس وقت تک بلاک بن کر آگیا تو فوراً پرچہ روانہ ہو سکے گا۔

اللہ کا شکر ہے کہ "افتتاح افتتاحیہ" آپ کو پسند آیا۔ یہ قدردانی نہیں قدرافزائی ہے اور وہ بھی نااہل کی۔ سچ یہ ہے کہ آپ کے کلمات محبت اور جذبات قدرافزائی کا شکریہ ادا کرنا چاہوں بھی تو نہیں ہو سکتا۔

ہائے تفصیل نہ لکھ کر آپ نے بہت بےچین کر دیا۔ خدا کے لئے صاف صاف لکھیں مفصل لکھیے اور جلد لکھیئے کہ آپ داستان درد آپ کب سنائیں گی، کب سنیں گی، کہاں سنائیں گی، کہاں سنیں گی، سچ کہتا ہوں اب مجھ سے صبر نہیں ہو سکتا۔ خدا جانے کس کس طرح اپنے غمگین اور زخمی دل کو سمجھا رہا ہوں، بہلا رہا ہوں، پھسلا رہا ہوں۔ لیکن یہی بیگانگی و لاعلمی قائم رہی تو چند مہینوں سے زیادہ نہیں جی سکتا۔ اس لئے چاہتا ہوں، آہ کس قدر چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی ہی میں آپ کی داستان درد سن لوں، اپنی غم بھری کہانی آپ کو سنا دوں اور پھر:

تم پہ ہاں تم پہ نثار ہو جاؤں مر جاؤں

آہ کوئی تدبیر ایسی نہیں کہ ہم ہمیشہ کے لئے مدت العمر نہ چھوٹنے کے لئے کبھی نہ بچھڑنے کے لئے ایک دوسرے سے مل جائیں۔ اس سوال کے جواب پر میری موت

لے قمر زمانی نے نقاد بابت اپریل ۱۹۱۷ء کے لئے جو افتتاحی مضمون بھیجا تھا اس کا بلاک بنوا کر چھاپنے کا اہتمام شاہ دلگیر نے کیا تھا۔

اور حیات منحصر ہے۔ خدا کے لئے سوچ سمجھ کر دینا اور وہ بات لکھنا جو حقیقۃً تمہارے دل میں ہو۔۔۔

ہائے اللہ کس قدر حسرت ہے کہ آپ کے سفر کے پروگرام میں کبھی غریب و بے بس آگرہ شامل نہیں ہوتا۔

پیاری کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ بریلی میں وجہ اطمینان کیا ہے، پیاری! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ دہلی یا لکھنؤ جانے کا کیا ارادہ کس لئے ہے تمہیں میری جان کی قسم سچ سچ بتا دو اپنے حالات کچھ تو لکھو کہ اطمینان ہو۔ میں کوئی مناسب حال مشورہ دے سکوں۔

کچھ کام آسکوں۔ ہمارا ہی جنازہ نکلتے دیکھو جواب نہ بتاؤ۔

اپنا بنایا ہے تو پھر اپنا ہی بنالو اور راز دل کہہ دو۔ کیا ہمارا اعتبار نہیں، نقاد قیامت کا نمونہ بن کر آپ کے سامنے انشاء اللہ تعالیٰ جلد حاضر ہوگا، لیکن ٹھکرا نہ دینا، غریب مر جائے گا۔ بلاک میں آپ کا خط "پری" معلوم ہوگا، دیکھئے گا۔

اپنی سیمیں کلائیوں کی قسم، بجنے والی چوڑیوں کی قسم، ہیرا تراش انگلیوں کی قسم، اس جذبات میں ڈوبے ہوئے خط کا جواب فوراً دینا کہ نقاد کی اشاعت سے پہلے مجھے مل جائے ورنہ انتظار میں پاگل ہو جاؤں گا۔ دوسرا خط نقاد کی اشاعت کے بعد۔

ہاں خوب یاد آیا، یہ لکھنا تو بھول ہی گیا کہ خط کے رنگ نے مار ڈالا، اُف یہ گلابی چھینٹے لے

اپنی قمر کا
"دلگیر"

دلگیر کا یہ خط قمر زمانی کے خط مرقومہ ۲۵ مارچ کا نہیں بلکہ ۲۵ مارچ سے پہلے لکھے ہوئے کسی خط کا ہے۔ لیکن قمر زمانی کے اس خط کی نقل مسودہ میں نہیں ہے۔ قمر زمانی اس کی نقل رکھنا بھول گئیں۔ یا پھر ضائع ہو گیا۔ یہ خیال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ دلگیر نے قمر زمانی کے خط مرقومہ ۲۵ مارچ کا جواب الگ سے ۲۸ مارچ کو دیا ہے اور دلگیر کے خط مرقومہ ۲۳ مارچ کی رسید قمر زمانی نے اپنے اگلے خط میں دی ہے۔

دلگیر کا خط مرقومہ ۲۸ مارچ دیکھئے:

لے: دلگیر کا یہ خط قمر زمانی کے کس خط کا جواب ہے اس کا سراغ مسودہ سے نہیں ملتا۔ غالباً قمر زمانی اس خط کی نقل اپنے پاس محفوظ نہیں رکھ سکیں۔

۲۸ مارچ ۱۹۷۱ء

آپ کا محبت نامہ ۲۵ مارچ کا لکھا ہوا آج مجھے ملا ہے۔ اس سے قبل ۲۴ مارچ کو ایک خط اور لکھ چکا ہوں۔ خدا جانے وہ بھی آپ کو ملا یا نہیں۔ مگر اب مل کے کیا ہوگا۔

اس خط کے آخری فقرے[1] پڑھ کر دل پر بجلی گر پڑی اور میں اس قابل نہ رہ گیا کہ آپ کی کسی بات کا بُرا بھلا جواب دے سکوں۔

آپ کو میری قسم انکار نہ کیجئے، خدا مبارک کرے۔

میں بدنصیب رہ کر بھی زندگی کاٹ دوں گا آپ اس کا غم نہ کریں بے کس نقاد کے مرجانے کا البتہ افسوس ہوگا۔ خیر اپنے ساتھ اسے بھی صبر کرلوں گا۔

حسرت نصیب
"دلگیر"

دلگیر کے اس خط سے ان کی جس بے دلی اور مایوسی کا اظہار ہوتا ہے وہ اس سے پہلے کے خطوط میں کہیں نظر نہیں آتا۔ قمر زمانی نے یہ لکھ کر کہ ان کی شادی کے مسئلے پر غور ہو رہا ہے، دراصل دلگیر کے دل پہ بجلی گرائی تھی اور اس کے بعد ان کی جو حالت ہوئی تھی اس کا اظہار انہوں نے انتہائی حسرتناک انداز میں کیا ہے۔ قمر زمانی نے ان کی اس حسرت ناکی اور مایوسی کو محسوس کر لیا اور اس خیال سے کہ مبادا دلگیر سے معاشقانہ خط و کتابت کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ انہوں نے فوراً دلگیر کے خط کا جواب دیا اور اس میں ان کی دلجوئی کا سامان مہیا کیا۔ قمر زمانی کا خط دیکھئے:

بریلی یکم اپریل ۱۹۷۱ء

۲۴ مارچ اور ۲۸ دونوں تاریخ کے نامہ ہائے محبت موصول ہوئے پہلے۔ عذرِ تاخیر قبول کیجئے اور پھر اس بات پر اظہار تاسف کہ آپ نے بھی کسی قدر کمزور دل پایا ہے دیکھئے خدا کے لئے ایسا نہ کیجئے کہ میری ہمت ٹوٹ جائے آپ کو آخر اس سے بحث

---

[1] قمر زمانی کے خط مرقومہ ۲۵ مارچ کے آخری فقرے یہ تھے:

"آج کل میرے متعلق ایک خاص مسئلے پر غور ہو رہا ہے، لیکن اب میں کسی طرح اس کی تحریک نہیں چاہتی۔ آپ ہی فرمائیے کیا کروں۔ سچ یہ ہے کہ ایک عورت کے لئے انکار جتنا سہل ہے اسی قدر دشوار بھی ہے۔ آپ فکر مند نہ ہوں کیونکہ دنیا میں کوئی کام میرے لئے اتنا سہل نہیں جتنا وہ جس کے لئے میں کوئی ارادہ کر چکی ہوں۔"

ہی کیا ہے میں پچھتاتی ہوں کہ کیوں لکھا، آپ اطمینان رکھیں سوائے آپ کے اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ میں آپ کو یہ خبر خوش سناتی ہوں کہ وہ جھگڑا اٹھ گیا اور بالکل میری مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔ پھر آپ خود فرمایئے کہ میری مرضی کیا ہو سکتی ہے۔ آپ ذرا سی بات میں مایوس ہو گئے۔ ابھی تو زندگی پڑی ہے اور خدا جانے کیا کیا برداشت کرنا ہے۔ ذرا مرد بنے رہیئے۔ مجھ کو تو آپ پر بڑا اعتماد ہے۔ اگلے خط میں مضمون کا انتظار کیجئے۔ نقاد کا سخت انتظار ہے۔

صرف آپ کی

"قمر"

قمر زمانی کے اس خط نے اپنا پورا کام کیا۔ دلگیر اس خط کو پڑھ کر نہال ہو گئے۔ ان کی طبیعت میں پھر نیا جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا اور انہوں نے قمر زمانی کو بلا تاخیر ایک محبت بھرا طویل خط اس طور پر لکھا:

۷ را پریل ۱۷ء

راحت جان دلگیر

ہائے کیا بتاؤں کس عالم اضطراب و یاس میں آپ کا مسیحا نامہ ملا۔ سچ یہ ہے کہ آپ کو مارنا بھی آتا ہے اور جلانا بھی۔ مارتے ہیں انہیں نظروں سے جلا دیتے ہیں۔

خدا تمہیں سلامت رکھے اور ایسی ایسی بے حقیقت جانیں تمہارے حسن دشوار پسند پر قربان ہوتی رہیں۔

عذر تاخیر قبول نہیں ہو سکتا۔

آہ جب مجھ ناشاد کی زندگی ہی یکسر تحیر و تاسف ہو تو پھر آپ اظہار تاسف نہ کریں تو مجھے تعجب ہو مجھے اس امر کا عجز کے ساتھ اعتراف ہے کہ ع

غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے

لیکن حیرت ہے کہ آپ اپنی نسائیت پہ جان دیتی ہیں مگر میرے کمزور و ناتواں دل کی قدر نہیں کرتیں کیا اس میں شان نسائیت نہیں۔

یہ خوب کہا "آپ کو اس سے کیا بحث"

مجھے اس سے بحث نہیں تو اب اور کسے ہو سکتی ہے۔ اب قمر (جان دلگیر) سوائے میرے کسی کی نہیں ہو سکتی اللہ اللہ یہ نصیب۔

ادھر آؤ لے لوں بلائیں تمہاری۔

اللہ اکبر و کدھر سجدہ کروں کہ "میرا معاملہ بالکل آپ کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔"

بہ ایں مژدہ گر جاں فشانم رواست
کہ ایں مژدہ آرائشِ جانِ ماست

پھر آپ کی مرضی کب پوری ہو گی؟

جب تک ہم نہ مل جائیں اس طرح کہ کوئی دنیاوی قوت ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکے، علیحدہ نہ کر سکے۔ اپنی بدبختی اور شوریدہ طالعی سے ہر وقت فراق کا کھٹکا ہے اور اک معمولی بات بھی مصیبت (اور وہ تو ذرا سی بات نہ تھی اس کے فیصلہ پر تو میری زندگی کا دارومدار تھا) لیکن ایک دفعہ مل جانے کے بعد میرے لئے ہر مصیبت راحت اور ہر تکلیف مسرت ہو گی۔ اس وقت آپ کو صحیح اندازہ ہو گا کہ میں کتنا مرد ہوں۔۔

یہیں تک لکھنے پایا تھا کہ ایک کبوتر کا جوڑا میرے کمرے (دفتر نقاد) میں چلا آیا اور ان کی مستانہ خوش فعلیوں نے مجھے بے ساختہ اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ مجھے دلگیر و افسردہ ہونا پڑا۔ جب یہ خیال آیا کہ میں تنہا ہوں اور مستی پر آں (کبوتر کی طرح خوش مستی میں کسی کے سامنے اظہار محبت کرنے سے مجبور ہے)

حیف ایسی زندگی پہ تم کہیں اور ہم کہیں

اف اس ظالم متوالے سے (جب اپنے اظہار تعشق کے آگے اتنی بھی فرصت نہیں کہ دیکھے اس کی ان مستی میں ڈوبی ہوئی حرکتوں کو کوئی مجبور دلگیر حسرت بھری نگاہ سے دیکھ رہا ہے اور تباہ ہوا جا رہا ہے) خدا سمجھے جس کم بخت نے میرے مردہ حسیات کو بیدار کر دیا ٹھنڈے جذبات میں آگ لگا دی۔

افسردہ داعیات شباب میں روح پھونک دی۔

آہ مجھ سے یہ عالم لطف و حسرت بیربےتابانہ اظہار شوق و محبت یہ بے حجابانہ انداز مواصلت زیادہ دیر تک نہ دیکھا گیا اور میں نے اس محرک جذبات و مصور حسیات کو اڑا دیا۔ لیکن نور جہاں کی طرح نہیں۔

آپ مجھ سے کوسوں دور تک لیکن سحر کاری تخیل دیکھئے کس قدر قریب ہے۔

جی چاہتا ہے ایک ۔۔۔۔۔۔۔ لے لوں ۔۔۔۔۔۔۔۔ اور پھر ۔۔۔۔۔۔

میں جواب اور مضمون کا بے صبری و شوق کے ساتھ منتظر ہوں۔ آپ نقاد کا انتظار کیجئے جو ۱۰ ار۔ اا رکم انشاء اللہ تعالیٰ شائع ہو جائے گا۔

پرچہ تیار ہے صرف بمبئی سے بلاک چھپ کرانے کا انتظار ہے۔ آج پھر تار دیا ہے۔ خدا کے لئے مختصر خط نہ لکھا کیجئے۔ یہ مجھ پہ ایسا ظلم جو کسی طرح برداشت نہیں ہو سکتا۔ آخر میرے شوق کی کچھ تو رعایت ہونی چاہیئے۔

"گل نہیں تو گل کی نکہت ہی سہی"

آپ کی طرح لکھنا نہیں آتا ورنہ خدا جانے کیا لکھتا۔

جان نثار

"دگیر"

قمر زمانی کو دگیر کا مندرجہ بالا خط یقیناً بروقت مل گیا ہوگا لیکن چونکہ یہ مفصل جواب چاہتا تھا اس لئے انہوں نے اپنے ۱۳ راپریل کے خط میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ قمر زمانی کا یہ خط بھی بہت مختصر ہے اور غالباً دگیر کو مزید کڑھانے کے لئے ہے۔ قمر زمانی کا خط دیکھئے:

۱۳ راپریل ۱۷ء

پیارے دگیر۔ ایک مختصر سا مضمون اور غزل پیش ہے۔ خدا کرے پسند آجائے دوسرا مضمون حسن کے عنوان سے دو چار روز میں روانہ کروں گی۔ رسید جلد دیجئے نقاد کی کیا خبر ہے۔

آپ کی

"قمر"

قمر زمانی کے اس خط کے ساتھ جو غزل اور مضمون منسلک تھے ان کو بھی اس جگہ نقل کیا جاتا ہے۔ پہلے غزل دیکھئے غالب کی مشہور زمین سے

حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگام کمال اچھا ہے   اس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہے

میں کہی گئی ہے اور "انکار جمیلہ" کے عنوان سے نقاد میں شائع ہوئی ہے۔

انکار جمیلہ [1]

(از قمر زمانی)

نزع میں بھی مری جانب سے خیال اچھا ہے
دم نکلتا ہے وہ کہتے ہیں کہ حال اچھا ہے
جو گزرنی تھی گزر ہی گئی اب کیا کہنا
آ گئے تم سر بالیں مرا حال اچھا ہے

---

[1] مطبوعہ نقاد (آگرہ) ص ۸۶ بابت مئی ۱۹۱۷ء تحویلہ بشیر حسین زیدی صاحب ماڈل ٹاؤن لاہور۔

روح آئی تنِ بے جاں میں امیدیں پلٹیں
اس نے پوچھا تھا بس اتنا ہی کہ حال اچھا ہے

جانتی ہوں نہ چھپے گی میری بے تابیٔ دل
کس بھروسہ پہ میں کہہ دوں مرا حال اچھا ہے

یہ نہ سمجھیں گے کہ اب تابِ تپش بھی نہ رہی
یہ کہیں گے کہ سکوں ہے ترا حال اچھا ہے

آنکھ ملنی تھی کہ دل ہی نہ رہا پہلو میں
اے فسوں ساز یہ نیرنگِ جمال اچھا ہے

کہتے ہیں وصل کا انجام جدائی ہے اگر
کیوں کہا تو نے قمر یہ کہ وصال اچھا ہے

اب قمر زمانی کا مضمون جسے ایک بلند پایہ انشائیہ کہنا چاہیئے۔ دیکھئے اس کا عنوان "اے کلی" ہے یہ بھی نقاد میں شائع ہو چکا ہے:

اے کلی[1]

وہ کلی جو رات میں، ایک چاندنی رات میں خدا جانے کس وقت میرے دھڑکتے ہوئے سینہ پر کھلی بھی اور مرجھا بھی گئی۔ سچ بتا تو کیا ہے۔

اے کرۂ رنگ و بو، اے عقدۂ بہار۔ شاعر تجھے صرف چند پتیوں کا مجموعۂ پریشانی کہتے ہیں۔ کہنے دے مگر میں تو تجھے ایک بر قعہ پوش نازنین سمجھتی ہوں اور تیری حس کی قائل ہوں کہ صبح تک تو میرے ہم نفس ہونے کا بھی بار نہ اٹھا سکی۔

رات کو جب میں نے تجھے اپنے بے قرار دل پہ بے چین پایا تو گھنٹوں تیری ننھی ننھی جنبش کو دیکھتی رہی اور غور کرتی رہی کہ اگر تجھ کو الگ کر دوں تو شاید میں اپنا اضطراب نہ دیکھ سکوں گی تو ہلتی تھی تو میں سمجھتی تھی کہ میرا دل دھڑک رہا ہے، اس لئے میں نے تجھے کہ تو بھی میرے ننھے سے دل کی طرح تھی وہیں سر ٹیکنے کے لئے چھوڑ دیا۔ میں نہیں کہتی کہ تو نے مجھے کچھ سکون دیا۔ مگر ہاں خدا جانے کیوں تیری جنبش، تیرے سیمیں تنفس کے اندر میں نے خاموش لوریوں کا سا لطف اٹھایا اور سو گئی ...... تو بدستور اپنا تنہا سر میرے سینے پر ٹیکتی رہی۔ تو اسی

---

[1] مطبوعہ نقاد (آگرہ) ص ۶۰۔۶۱ بابت ۱۹۱۷ء مملوکہ بشیر ضیائی ماڈل ٹاؤن لاہور۔

طرح میرے سینہ پہ لہریں سی لیتی رہی، گویا تو ایک نقرئی چھوٹی سی کشتی تھی جو بلوریں سطحِ آب پہ ڈگمگا رہی تھی۔

جب چاند کی کرنیں میرے پریشان بالوں کو آخری بار چوم کر آہستہ آہستہ دبے پاؤں چلی جا رہی تھیں، جب صبح کی روشنی میرے تلووں میں گدگدی سی پیدا کر رہی تھی جب بادِ نسیم کے نرم و نازک ہاتھ میرے آنچل کو تان تان کر رہ رہ جاتے تھے جب میری پازیب کے گھنگھروؤں میں جھنکار آہستہ آہستہ بیدار ہونا چاہتی تھی۔ ہاں جب عمانِ نور کی فضا میں میری انگڑائیوں سے ایک مد و جزر کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی تو میری پلکیں ایک دوسرے سے جدا ہوئیں اور میری چڑھی ہوئی پتلی جو بادل میں نصف چھپے ہوئے چاند کی طرح نظر آتی تھی۔ سب سے پہلے تجھی پہ پڑی مگر اب تو کلی نہ تھی اک پھول تھی مرجھایا ہوا۔ .... ہائے تو نے مجھے سوتے ہوئے کس رنگ میں پایا کہ تیرا سارا گریبان چاک ہے تو نے مجھ میں وہ کون سی بات دیکھی کہ تیرا کلیجہ پاش پاش ہے۔ کاش میں تجھے دیکھ سکتی جب تجھ میں اول اول جنبشِ شگفتگی پیدا ہوئی۔ میں اندازہ کر سکتی کہ تیری قبائے احرام کیونکر تار تار ہوئی۔ خدا جانے تیری پنکھڑیوں میں سب سے پہلی شکن کس طرح پڑی ہوگی اور افسردگی کا یہ زرد سا مٹیالا رنگ کیونکر رفتہ رفتہ چڑھا ہوگا۔ آہ میں کیوں سو گئی! میں نے تجھے کیوں موقعہ دیا کہ میری نیند میں تو اپنی آنکھیں کھول کر تباہ و برباد ہو جائے۔ کیا تو اب پھر کلی نہیں ہو سکتی۔ کیا اپنی پنکھڑیوں سمیٹ کے تو اپنی ردائے سیمیں پہ نہیں لپیٹ سکتی ...... نہیں تو نہیں کر سکتی۔ میں جانتی ہوں اب تو صرف آفتاب کی کرنوں کا انتظار کر رہی ہے کہ وہ تیری رہی سہی تازگی کو جذب کریں اور تو خشک ہو کر میرے سینہ سے جدا ہو جائے مگر نہیں میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی۔ تجھے خاک ہو جانے کی مہلت نہ دوں گی۔ ہوا کا حصہ صرف تیری نکہت تھی، سو وہ لے اڑی۔ تیرا جسم میں محفوظ رکھوں گی، تیرا تنِ نازنین میری اُس رات کی یادگار ہے جب میں نے کسی کی یاد میں وہ خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر میں کسی سے نہیں پوچھ سکتی اور اس لئے تو ہمیشہ اسی خواب کے پاس رہے گی۔

میں تجھے مرقع (البم) میں وہاں رکھوں گی جہاں میں کاغذ پر اب بھی خواب ہی دیکھ رہی ہوں۔

اے کلی، اے پژمردہ کلی۔ اے خشک ہو کر خاک ہو جانے والی کلی۔ آرام کر

تو نے میرے سینہ پر ایک رات بسر کی ہے، تو تیری خاک بھی میرے دامن ہی میں رہیگی۔
لے میں قبائے تصویر میں تجھے لپیٹ کر وہاں بھیجتی ہوں جہاں ایک تنہا سا مزار بائیں پہلو میں میری صورت کے لئے تڑپ رہا ہے بے قرار ہے۔

"قمر زمانی"

قمر زمانی کا خط مرقومہ ۱۳ اپریل بہت مختصر تھا لیکن ایک غزل اور ایک مضمون منسلک کر کے انہوں نے اختصار خط کی تلافی کر دی تھی۔ دلگیر نے خط ملتے ہی اس کا جواب لکھا۔ اس میں اختصار نویسی کی شکایت بھی کی لیکن برائے نام۔ غزل اور مضمون میں انہوں نے معنوی حیثیت سے وہ سب کچھ پالیا ہے جس کے وہ متمنی تھے۔ چنانچہ انہوں نے غزل کے ایک ایک شعر اور "اے کلی" کے ایک ایک لفظ کے معنی اپنے مزاج کے موافق نکالے اور داد و تحسین میں کھو گئے۔ دلگیر کا یہ خط بھی خاصا طویل ہے اور ان کی کمال انشا پردازی کا ایک نمونہ ہے۔ اصل خط دیکھئے:

۱۴ اپریل ۱۷ء

پیاری

جذب محبت دیکھئے (آج آپ کا (چاند سا) خط ملا اور آج ہی آپ کو نامہ دلگیر (نقاد) مل گیا ہوگا۔ کل جس وقت آپ کا خط پوسٹ ہوا ہے (1.30.P.M) ٹھیک اسی وقت نقاد بھی ڈاک میں ڈالا گیا تھا۔ لکھئے کب ملا؟

میرے طویل خط کا مختصر و تشنہ جواب، میرے شوق کی یہ رعایت معکوس، داد قبول فرمائیے۔ میرے سراپا آرزو سوال کو آپ نے اب تک لاجواب رکھا۔ آپ کی مرضی لاجواب ہی رکھیئے۔ اس ادا پہ بھی جان نثار رہے ہے

مطلب کی کہی نہ ایک ظالم کیا بات ہے تیری گفتگو کی!

اب کسی طرح صبر نہیں ہو سکتا۔ ہائے اللہ کیا کروں۔ کلی نے اور آگ لگا دی۔ نقاد دیکھ کر تفصیلی رائے لکھئے۔ کیسا نکلا۔ جو نقائص رہ گئے ہیں مطلع فرمایئے کہ دور کر دیئے جائیں۔ میں چاہتا ہوں نقاد آپ کے خیالات کی تصویر مرمریں بن کر نکلے اس لئے ہمیشہ ٹوکتی رہیئے۔

"حسن" کا منتظر ہوں۔ جلد آئے۔ لے

لے: قمر زمانی نے اپنے خط مرقومہ ۱۳ اپریل ۱۷ء کے ساتھ ایک غزل اور مضمون بھیجا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا کہ ایک مضمون بہ عنوان "حسن" مکمل ہو رہا ہے۔ جلد بھیج دیا جائے گا۔ اس جگہ اسی طرف اشارہ ہے۔

غزل اور کلی دیکھی۔ کیا بتاؤں افسردہ دل پر کیا گذر گئی۔ ایک گھنٹہ سے کم نہیں روپا۔ اب بھی آنکھیں نم ہیں۔ یہ ان کی داد ہیں۔

غزل سراسر حال ہے کس کس شعر کی داد دوں خصوصاً مطلع اور ان اشعار نے کلیجہ نکال لیا۔

(۱) روح آئی تنِ بے جان میں امیدیں پلٹیں
اس نے پوچھا تھا بس اتنا ہی کہ "حال اچھا ہے؟"

(۲) یہ نہ سمجھیں گے کہ اب تابِ تپش بھی نہ رہی
یہ کہیں گے کہ سکون ہے تیرا حال اچھا ہے

(۳) آنکھ ملتی بھی کہ دل ہی نہ رہا پہلو میں
اے فسوں ساز یہ نیرنگ جمال اچھا ہے

"اے کلی"

اف اس دلگیر عنوان نے کہیں کا نہ رکھا۔ کلی کے پردے میں مخاطب صحیح کون ہے آہ، یہ میں نہیں جانتا مگر اتنا جانتا ہوں کہ جیسے کوئی مجھ پر گزری ہوئی بیتے بیتے کی کہہ رہا ہے اور شبِ دلگیر کی یاد دلا رہا ہے۔ جب چاند نظر کے سامنے آتے ہی چھپ گیا تھا، اوجھل ہو گیا تھا۔ آہ میں اس چاندنی رات کے خواب کو اب تک نہیں بھولا جسے میں نے بیداری میں کبھی دیکھا تھا۔

در مضمون سر سے پا تک تخیل ہی تخیل ہے کن کن نزاکتوں کی داد دی جائے۔ اگر قوت اتنی ہی مجروح ہے تو میرا قصور نہیں۔

میں وہ زبان کہاں سے لاؤں جس سے لطافت جذبات کی داد دوں۔ تاہم جہاں آپ کی نازک خیالی میری آنکھ سے آنسو بن کر ٹپکی اسے قوسین ( ) میں لے کر ظاہر کرتا ہوں۔ آپ بھی ایک اچٹتی ہی نگاہ ڈال لیجئے۔

۱۔ (اے گرہ رنگ و بو، ایک عقدہ بہار) اس خطاب پر شعرا کے ہزاروں دیوان نثار۔

۲۔ (اور تیری حس کی قائل ہوں کہ صبح تک تو میرے ہم نفس ہونے کا بار بھی نہ اٹھا سکی) آپ نے کس قیامت کی چٹکی لی ہے۔ دلّی کا گزرا ہوا واقعہ یاد آگیا۔ آہ کس قدر شرمندہ ہوں۔

۳۔ (جب چاند کی کرنیں میرے پریشان بالوں کو آخری بار چوم کر آہستہ آہستہ چلی جا

رہی تھیں...... میری انگڑائیوں سے ایک مادرِ جنر کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی)

ہائے کتنی حسرت ہے۔ اس وقت جب یہ عالم کیف طاری تھا میں موجود نہ تھا ورنہ میری جان نثاری سے ان اداؤں میں جان پڑ جاتی۔ بتایئے:

کیا میری قسمت میں کوئی ایسی رات نہ تھی

۴۔ (میری نیند میں تو اپنی آنکھیں کھول کر تباہ و برباد ہو جائے) کاش یہ موقع مجھے نصیب ہو۔

۵۔ (تیرا تن نازنین ...... تو ہمیشہ اسی خواب کے پاس رہے گا)

۶۔ (میں تجھے مرتبع میں ...... خواب ہی دیکھ رہی ہوں)

۷۔ (اے کلی ...... میرے دامن میں رہے گی)

۸۔ (اے، میں تبائے تصویر ...... میری صورت کے لئے تڑپ رہا ہے بے قرار ہے)

کیا ان جذبات لطیف و خیالات نادر کی داد دی جا سکتی ہے۔ کیا ان ٹکڑوں کا کوئی مول ہو سکتا ہے، جس کے معاوضے میں جان شے بے حقیر ہے۔

بہرکیف یہ ہے کہ نہ اس سے بہتر تمہید ہو سکتی ہے اور نہ خاتمہ۔ خاتمہ پر جس قدر ناز کروں کم ہے کہ اس کا مخاطب دنیا میں دلگیر کے دل کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

"ایک ننھا سا مزار"

آپ کی زبان سے سنتے ہی دل اچھل پڑا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کلی بھی اس کے ساتھ ہی ساتھ اچھل رہی تھی اور زبان حال سے گویا تھی:

"میں وہاں پہنچ گئی جہاں مجھے پہنچ جانا چاہئے تھا"

کیا میں اس چاند سی صورت کو دیکھ سکتا ہوں جس کے یاسمین سینہ پر اس کلی نے ایک رات پوری ایک چاندنی رات بسر کی ہے۔ کیا مجھے بھی یہ شرف و افتخار حاصل ہو سکتا ہے کہ ایک رات مل کر بسر کر لینے کے بعد میری خاک آرزو بھی آپ کے دامن رنگین میں رہے۔ خدا کے لئے ان سوالوں کا عملی جواب دیجئے ورنہ حسرت ہی میں تمام ہو جاؤں گا جو آپ کو منظور نہیں۔

ایک جگہ آپ نے لکھا ہے "اے پژمردہ کلی" پژمردہ کی جگہ دلگیر لکھ دیتیں تو میری آبرو یقیناً بڑھ جاتی۔ مگر ابھی قسمت کہاں یہ۔

آپ ہنسیں گی اگر میں یہ کہوں کہ اپنے مضمون اور غزل کی معرفی کے خود ہی نوٹس لکھ دیجئے کیونکہ میں اپنی قابلیت کو اس فرض کی ادائیگی سے قاصر پاتا ہوں۔ کم از کم میری

یہ خواہش تو پوری کرنی ہو گی۔

دیکھو! تمہیں ہماری قسم انکار نہ کرنا ـــ

جواب فوراً آئے اور مفصل ـــ

کیوں کر کہوں

آپ کا

" دگیر "

دگیر کے اس خط کے ساتھ ساتھ قمر زمانی کو نقاد کا تازہ پرچہ مل گیا۔ نقاد جنوری ۱۹۱۳ء میں جاری ہوا تھا۔ دو سال تین مہینے یعنی مارچ ۱۹۱۵ء تک نکلتا رہا۔ پھر مالی مشکلات کی بنا پر بند ہو گیا قمر زمانی نے اپنے خطوط کے ذریعہ دگیر کو نقاد کے دوبارہ اجرا پر اکسایا اور کامیاب ہوئیں، چنانچہ پورے دو سال بعد اپریل ۱۹۱۷ء میں نقاد پھر اسی آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آ گیا۔ اب کے قمر زمانی بھی جوائنٹ مدیرہ کی حیثیت سے اس کی ادارت میں شریک تھیں۔ نقاد اپنے دور اولین میں بھی انشائے لطیف یا شعر منثور کی تحریک کی نمائندگی کرتا تھا۔ لیکن دوسرے دور میں قمر زمانی سے اپنے رومانی تعلقات کے زیر اثر، دگیر نے اس کو تخیل پرستانہ انشائیوں کا مرقع بنا دیا۔ قمر زمانی اور دگیر کی آئندہ خط کتابت میں چونکہ نقاد کا نیا پرچہ بابت ۱۹۱۷ء بھی زیر بحث آئے گا اس لئے ان کی مراسلت سے لطف اندوز ہونے کے لئے نقاد کے تازہ پرچے کی بھی ایک جھلک دیکھتے چلئے ـــ

اس پرچے میں قمر زمانی کے دو مضمون ہیں، ایک افتتاحی مضمون جس کا عنوان ہے "نقاد کی زندگی کا دوسرا دور، ادر میں" اور دوسرا مختصر مضمون "جاندار پتی" یہ دونوں مضمون قمر زمانی کے خطوط کے ساتھ پچھلے صفحوں میں کسی جگہ نقل کئے جا چکے ہیں، دگیر کا مضمون "افتتاح افتاحیہ" دگیر کے خط مرقومہ ۱۷ر مارچ ۱۹۱۷ء کے ساتھ آپ کی نظر سے گزر چکا ہے۔ قمر زمانی کا افتتاحی مضمون انہیں کے خط میں بلاک بنوا کر ابتدائی صفحوں میں شائع کیا گیا ہے۔ پورا پرچہ پچاس صفحوں کا ہے۔ دگیر نے اپنا مضمون "افتتاح افتتاحیہ" کے نام سے صفحہ ۴۴ پر دیا، یہ تین صفحوں میں پھیلا ہوا ہے۔ صفحہ ۴۷ پر اپنے مضمون کے بالکل وسط میں دگیر نے قمر زمانی کے مختصر مضمون "جاندار پتی" کو جگہ دی ہے اور اس پر یہ تعارفی نوٹ لکھا ہے:

"اس دل کے ٹکڑے پر دفتر کے دفتر نثار ہیں۔ چند سطریں مگر عطر زندگی۔ لکھنے والی نے اس میں بڑے بڑے نازک خیالوں کا ست کھینچ لیا ہے۔

اس نمبر میں بہت پاکیزہ مضامین ہیں بڑی پیاری نازک خیالیاں ہیں مگر یہ

کہتا ہوں کہ سارے نقاد میں اس چاند کے ٹکڑے کا جواب نہیں جسے دیکھ کر میرا
جی چاہتا ہے اب کبھی قلم ہاتھ میں نہ لوں (دگیر)"
قمر زمانی اور دگیر کے ان مضامین کے علاوہ مندرجہ ذیل اصحاب کے مضمون اس
ہیر پھیر میں شامل ہیں:

ہندوستان کی موسیقی	مولانا عبدالحلیم صاحب شرر ایڈیٹر دلگداز
اردو لٹریچر کا نفسِ واپسیں	ایم مہدی حسن صاحب افادی
ایک رقاصہ سے	مولانا نیاز محمد صاحب نیاز فتح پوری
ان سے دور	ابوالمعالی مولوی محمد الدین صاحب خلیقی دہلوی۔
بلبل اور گلاب	"عکاس"

یہ سارے مضامین تخیل کی گلابی اور بادۂ شباب میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ مولانا شرر کا مضمون اگرچہ تاریخی، تحقیقی اور عالمانہ ہے لیکن نفسِ مضمون کے اعتبار سے نقاد کی رومانی فضا کے لئے سازگار ہے۔ یہی صورت مہدی افادی کے مضمون کی ہے۔ اس کا تعلق اگرچہ اردو ادب کے بعض مسائل سے ہے لیکن افادی کے انداز تحریر کی رنگینی و حسن کاری نے اس میں انشائیے کا سا لطف پیدا کر دیا ہے۔ باقی تینوں مضمون کلیتہً "شعر منثور" کے ذیل میں آتے ہیں سرسید کی عقلیت پسند تحریک ادبی کے بعد اردو میں انشائے لطیف کے نام سے تخیل پرستی اور رومان پسندی کی جو لہر اٹھی تھی یہ مضامین اسی لہر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ دگیر نے ان مضامین کو ادارتی نوٹ کے ساتھ نقاد میں جگہ دی ہے۔ نیاز اور خلیقی کے مضامین، انشاپردازی کے اعلیٰ نمونہ ہونے کی حیثیت سے ادب کے شہ پارے ہیں۔ یہ ہمیشہ زندہ رہنے والے مضامین ہیں۔ تیسرا مضمون "بلبل و گلاب" "عکاس" کے نام سے شائع ہوا ہے لیکن یہ ایک فرضی نام ہے۔ دگیر نے اس مضمون کے شروع میں یہ تعارفی نوٹ دیا ہے:

'عکاس' یہ بالکل نیا نام ہے جو نقاد کی معجز نمائی سے عالمِ وجود میں آیا ہے اس آئینہ کے اندر ایک جوہر لطیف پنہاں ہے جو اس سے قبل کہیں نہ نظر آیا ہوگا۔ صاحب مضمون باوصف لطیف الطبع ہونے اور مذاق سلیم رکھنے کے پبلک میں نہیں آنا چاہتے تھے اور اب بھی بے پردہ آنا انہیں منظور نہیں۔ اپنے چہرۂ انور کے لئے عکاس کا نقاب پسند فرمایا ہے لیکن بالغ نظروں سے ان کی تحریر کا حسن نہیں بچ سکتا ہے

حسن چھپتا ہے کہیں اہل نظر کے آگے
لاکھ تصویر کے پردے میں چھپانا چاہا

(ایڈیٹر)

ایڈیٹر کا یہ نوٹ خود بتاتا ہے کہ "عکاس" فرضی نام ہے۔ یہ مضمون بھی میرا خیال ہے کہ نیاز فتح پوری کا ہے اور اس میں "بلبل و گلاب" کے پردے میں قمر زمانی اور دلگیر کے معاشقے اور مراسلت کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس لئے کہ اس مضمون کے علاوہ بھی قمر زمانی کے مسودات میں ایک اور چند سطری انشائیہ "عکاس" کے نام سے مکتوب کی صورت میں اس طرح ملتا ہے۔

کلکتہ

کانگریس ہال

اس بھونرے کی طرح جو ایک سہانی شام کی فضا میں ادھر سے ادھر کسی نکہت نادر و غریب کی تلاش میں سرگرداں باغوں میں دیکھا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح پہلو میں ایک دھڑکنے والی ایک بوئے عنبریں کے لئے بے چین ہونے والی چیز مجھے لفظئے بنگالہ میں لے پہنچی۔

کلکتہ جا کر میں کیوں فنا ہو جاتا اگر یہ بے ارادہ مگر ہمہ عزم شے (شاید دل کی حقیقت یہی ہے) میرے پاؤں کا چکر نہ بن جاتی۔

اس بھونرے کی طرح جو باغ میں کسی شیریں پھول کو دیکھ کر بے تابانہ اس سے لپٹ جاتا ہے اور پھر نشہ ہلاکت کے کیف سے مدہوش نظر آتا ہے۔ میری جوئندہ نگاہوں نے بھی تجھے دیکھ لیا۔

میں باوجود دعا و خودداری کی سعی تمام کے وہاں پہنچا جہاں تو تھی اور مجھے کہنے دے کہ میری نگاہیں تیرے جلوے کی شراب زریں کی جرعہ کشی کیا کیں۔ یہاں تک کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اگر کائنات میں عشرت کا وجود کہیں ہے تو وہ اس وقت مجھے یہاں حاصل ہے۔

(عکاس)

اس خط نما انشائیہ سے گمان ہوتا ہے کہ "نقاد" میں "بلبل و گلاب" کے عنوان سے جو مضمون "عکاس" کے نام سے شائع ہوا ہے وہ بھی نیاز فتح پوری ہی کا ہے۔ اس خیال کو یوں بھی تقویت پہنچتی ہے کہ نقاد میں کبھی قمر زمانی کے نام سے، کبھی کہکشاں کے نام سے، کبھی ناہید کے نام سے، کبھی ثریا کے نام سے اور کبھی بلقیس کے فرضی نام سے رومانی

تحریروں کا کھیل نیاز صاحب کھیل رہے تھے۔ چونکہ "بلبل و گلاب" ایک بلند پایہ انشائیہ ہے اور ادب کے قارئین کی نظر سے اوجھل ہے اس لئے یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"بلبل و گلاب"

"اس نے کہا ہے کہ وہ میرے ساتھ رقص کرے گی۔ اگر میں اس کے لئے سرخ گلاب لا دوں۔ نوجوان طالب علم پکار اٹھا۔ لیکن میرے باغ میں تو کوئی سرخ گلاب نہیں ہے۔ اپنے آشیانہ میں۔ سدا بہار شاہ بلوط کے درخت پر بلبل نے اسے سنا، پتیوں میں سے جھانکا اور متعجب ہوئی۔"

"میرے تمام باغ میں ایک بھی سرخ گلاب نہیں" وہ پھر بولا اور اس کی حسین آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ آہ کس قدر حقیر چیزوں پر آسودگی منحصر ہے۔ میں نے وہ سب کچھ پڑھا ہے جو عقلا نے لکھا ہے اور فلسفہ کے راز گویا میرے اپنے ہیں۔ لیکن ایک سرخ گلاب، کے نہ ہونے نے میری زندگی کو المناک بنا دیا ہے۔"

"بالآخر یہاں ایک سچا عاشق مل ہی گیا" بلبل بولی راتیں گزر گئیں ہیں کہ میں اس کا گیت گایا کرتی ہوں، حالانکہ میں اسے نہیں جانتی تھی۔ راتیں گزر گئی ہیں کہ میں اس کی کہانی ستاروں کو سنایا کرتی ہوں اور آج میں اسے دیکھ رہی ہوں۔ اس کے بال سیاہ ہیں، سیاہ جیسے غنچۂ سنبل اور اس کے ہونٹ سرخ ہیں، سرخ جیسے گلاب جس کی اسے تلاش ہے۔ لیکن محبت نے اس کے چہرے کو زرد بنایا ہے۔ اور غم نے اپنی مہر اس کی پیشانی پر ثبت کر دی ہے۔" "شہزادہ کے یہاں کل شب کو جلسہ رقص ہونے والا ہے" نوجوان طالب علم پھر آہستہ سے بولا" اور میری محبوبہ بھی شریک ہوگی۔ اگر میں اسے ایک سرخ گلاب لا دوں تو میں اسے اپنی آغوش میں لے سکوں گی اور وہ اپنا سر میرے شانہ پر ڈال دے گی اور اس کے ہاتھ میرے ہاتھوں میں ہوں گے۔ مگر میرے باغ میں تو ایک بھی سرخ گلاب نہیں ہے اس لئے میں تنہا بیٹھا رہوں گا اور وہ میرے پاس سے گزر جائے گی۔ ذرا توجہ نہ کرے گی اور میرا دل ٹوٹ کر رہ جائے گا۔"

"حقیقتاً یہ ایک سچا چاہنے والا ہے۔" بلبل نے کہا" جس کا میں گیت گاتی ہوں یہ اس کا بھگاہے جو چیز میرے لئے مسرت ہے وہی اس کے لئے الم ہے یقیناً محبت عجیب و غریب شے ہے وہ زمرد سے زیادہ قیمتی اور نفیس لال سے زیادہ گراں بہا ہے۔ ہیرے اور موتی سے اس کا سودا نہیں ہو سکتا اور نہ وہ

بازار میں پیش کی جا سکتی ہے۔ دنیا کی تمام دولت اس کی قیمت ادا نہیں کر سکتی اور نہ وہ سونے کے عوض میں وزن کی جا سکتی ہے۔ مطرب اپنی اپنی جگہوں پر تارہائے رباب کو چھیڑیں گے اور میری محبوبہ نغمہ بربط و سرود پر رقص کرے گی وہ رقص کرے گی، ایسا سبک رقص کہ گویا اس کے پاؤں فرش کو چھوتے ہی نہیں ارباب محفل پر تکلف لباس میں اس کے گرد جمع ہوں گے مگر وہ میرے ساتھ رقص نہیں کرے گی۔ کیونکہ میرے پاس کوئی سرخ گلاب اس کے دینے کو نہیں ہے یہ کہہ کر اس نے اپنے آپ کو فرش سبزہ پر ڈال دیا اور سر جھکا کر رونے لگا۔

"یہ کیوں رو رہا ہے۔ ایک کوے نے پوچھا جبکہ وہ اس کے پاس سے گزرا۔"

"سچ تو یہ ہے آخر کیوں، ایک تیتری بولی جو شعاع آفتاب سے پیدا ہونے والی فضائے نور میں تھر تھرا رہی تھی۔"

"ہاں آخر اس رونے کا سبب" ایک گل بہار نے اپنے ہمسایہ سے نہایت دبی آواز میں سرگوشی کی "وہ ایک سرخ گلاب کے لئے رو رہا ہے" بلبل نے کہا۔

"کیا ایک گلاب کے لئے"۔ وہ سب بولے "کتنا مضحک خیال ہے" اور وہ کوا جو کسی قدر مغرور بھی معلوم ہوتا تھا ہنسا اور قہقہہ مار کر ہنسا۔

مگر بلبل، طالب علم کے راز الم کو سمجھ گئی اور شاہ بلوط کے درخت میں خاموش بیٹھی رہی اور طلسم نار محبت پر غور کرتی رہی۔ یکایک اس نے اپنے بازوؤں کو پرواز کے لئے ہوا میں پھیلا دیا اور فضا میں صعود کر گئی۔ اس نے ایک کنج کو سایہ کی طرح طے کیا اور سایہ ہی کی طرح ایک باغ کو عبور کر گئی۔ ایک سبزہ زار کے وسط میں ایک گلاب کا درخت لگا تھا بلبل نے جب اس درخت کو دیکھا تو اس کی طرف اتری اور ایک شاخ پر بیٹھ گئی۔

"مجھے ایک سرخ پھول دے" وہ بولی "میں اپنا شیریں ترین نغمہ تجھے سناؤں گی۔"

لیکن درخت نے اپنا سر ہلایا "میرے پھول سفید ہیں۔ اس نے جواب دیا۔ سفید جیسے کف دریا اور سفید تر پہاڑوں کی برف سے۔ لیکن تو میرے بھائی کے پاس جو پرانی دھوپ گھڑی کے پاس ملے گا۔ شاید وہ تجھے ایسا پھول دے گا جس کی تجھے تلاش ہے۔ چنانچہ وہ وہاں سے اڑ کر اس درخت کے پاس پہنچی جو دھوپ گھڑی کے پاس تھا۔

"مجھے ایک سرخ پھول دے" وہ بولی "میں تجھے اپنا شیریں ترین نغمہ سناؤں گی۔"

لیکن درخت نے اپنا سر ہلایا "میرے پھول زرد ہیں" اس نے جواب دیا "زرد جیسے بنت البحر کے بال جو ایک تخت کہربا پر بیٹھی ہے اور زرد تر ہیں اس گل نرگس سے جو آخر ایام خریف میں، قبل اس کے کہ وہ کاٹ لی جائے۔ چراگاہوں میں پھولتا ہے۔ لیکن تو میرے بھائی کے پاس جا جو طالب علم کی کھڑکی کے نیچے لگا ہوا ہے۔ شاید وہ تجھے ایسا پھول دے سکے گا جس کی تجھے تلاش ہے۔"

چنانچہ وہ وہاں سے اڑ کر اس درخت کے پاس پہنچی جو طالب علم کی کھڑکی کے نیچے لگا ہوا تھا۔

"مجھے ایک سرخ پھول دے" وہ بولی "اور میں تجھے اپنا شیریں ترین نغمہ سناؤں گی۔" لیکن اس درخت نے اپنا سر ہلایا۔ "میرے پھول سرخ ہیں۔ اس نے جواب دیا "ایسے سرخ جیسے فاختہ کے پاؤں اور سرخ تر ہیں۔ شاخ مرجان سے جو بحری غاروں میں لہریں لیتی رہتی ہے۔ لیکن سردی نے میری شرائین کو منجمد کر دیا ہے میرے غنچوں کو پالا مار گیا ہے اور طوفان نے میری شاخیں توڑ ڈالی ہیں اور اس سال مجھ میں کوئی پھول نہ آئے گا۔"

"ہاں ہے ایک طریقہ ہے" درخت نے جواب دیا "لیکن وہ اس قدر خوفناک ہے کہ میں تجھ سے کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

"مجھ سے کہہ" بلبل بولی "میں خوف نہ کھاؤں گی"

"اگر تو سرخ گلاب چاہتی ہے" درخت نے کہا "تو تجھے نور ماہ میں ایک پھول اپنی موسیقی سے تیار کرنا چاہیئے اور اسے اپنے خون دل سے رنگیں۔ تجھے چاہیئے کہ تو مجھے گا کر سنا، مگر وہ نغمہ تیرے سینے سے پیدا ہو۔ اس حال میں کہ وہ ایک کانٹے سے پیوستہ ہو۔ تمام شب تو مجھے گانا سناتی رہ اور کانٹا تیرے دل میں چبھتا رہے اور تیرا خون حیات میری رگوں میں بہنے لگے اور میرا ہو جائے۔"

ایک پھول کی قیمت ایک پوری زندگی بڑی قیمت ہے" بلبل نے کہا "اور جان سب کو عزیز ہے۔ دشت زمردیں میں بیٹھ کر آفتاب کو سنہری رتھ میں اور ماہتاب کو موتیوں کی گاڑی میں نکلتے دیکھنا نہایت خوشگوار نظارہ ہے۔ شیریں ہے پھولوں کی نکہت اور لطیف ہے۔ ان کی رنگینی جو کسی وادی میں پوشیدہ شگفتہ ہوں۔ یا جو پہاڑیوں پر کھل کر انہیں گلستان زار بنا دیں۔ تاہم محبت زندگی

سے بھی بہتر شے ہے اور ایک پرند کے دل کی ایک انسانی قلب کے مقابلہ میں کیا حقیقت ہے۔"

"چنانچہ اس نے اپنے بھورے پروں کو پرواز کے لئے ہوا میں پھیلا دیا اور فضا میں صعود کر گئی وہ باغ پر سے سایہ کی طرح گزر گئی اور سایہ ہی کی طرح وہ کنج کو عبور کر گئی۔

نوجوان طالب علم ابھی تک سبزہ پر پڑا ہوا تھا۔ جہاں وہ اس کو چھوڑ گئی تھی اور ہنوز اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو خشک نہ ہوئے تھے۔

"خوش ہو جا" بلبل پکار اٹھی "خوش ہو جا تجھے گلاب کا پھول مل جائے گا۔ میں اسے چاندنی میں اپنی موسیقی سے تیار کروں گا اور اپنے خون دل سے رنگیں جو کچھ اس کے عوض میں مجھے کہنا ہے وہ یہ ہے کہ کیا تم سچی محبت کرنے والے ہو۔ کیونکہ محبت فلسفہ سے عقلمند تر ہے اگرچہ وہ بھی عقلمند ہے اور طاقت سے قوی تر ہے۔ اگرچہ وہ بھی قوی ہے شعلہ رنگ ہیں اس کے بازو اور رنگین ہے شعلہ کی طرح اس کا جسم۔ اس کے لب شیریں ہیں مانند عسل اور اس کا سانس خوشگوار مثال بخور"

طالب علم نے سبزہ پر سے سر اٹھایا اور سنا لیکن جو کچھ بلبل اس سے کہہ رہی تھی نہ سمجھ سکا۔ کیونکہ وہ صرف وہ باتیں جانتا تھا جو کتابوں میں لکھی ہیں"۔ لیکن شاہ بلوط کا درخت سمجھ گیا اور غمگین ہوا کیونکہ وہ اس بلبل کو بہت چاہتا تھا۔ جس نے اپنا آشیانہ اس کی شاخوں میں بنا لیا تھا۔

"مجھے ایک نغمہ آخری سنا" اس درخت نے دبی آواز سے کہا "میں تیرے چلے جانے کے بعد اپنی تنہائی سے نہایت متاثر ہوں گا۔"

چنانچہ بلبل نے اس شاہ بلوط کے درخت کو اپنا نغمہ سنایا۔ اس کی آواز ایک ایسی موسیقی تھی جو کسی ظرف سیمیں کے اندر پانی کے بلبلوں سے پیدا ہو۔

جس وقت اس نے اپنا گانا ختم کیا وہ طالب علم اٹھ بیٹھا اور ایک نوٹ بک اور پنسل اپنی جیب سے نکالی "کیا وہ احساس بھی رکھتی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ نہیں۔ حقیقتاً وہ ایک صناع یا نقاص کی طرح ہے وہ بغیر کسی خلوص کے صرف تصنع ہے۔ وہ دوسروں کے لئے اپنے آپ کو قربان نہیں کرے گی۔ وہ صرف موسیقی کی دھن میں رہتی ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ صنعت خود غرض ہے

تاہم اعتراف کرنا چاہیے کہ اس کی آواز میں بعض نہایت دلپذیر سر ہیں۔ کتنا قابل رحم دل ماجرا ہے کہ ان کے کچھ معنی نہیں اور کوئی عملی خوبی ان میں نہیں ہے اور وہ اپنے کمرے کے اندر چلا گیا۔ بستر پہ پڑ گیا اور خیال معشوق میں محو ہو گیا اور کچھ عرصہ کے بعد اسے نیند آ گئی۔

اس وقت جبکہ چاندنی نے آسمان کو منور کیا بلبل اس گلاب کے درخت کے پاس پہنچی اور اپنا سینہ خار میں پیوست کر دیا۔ تمام شب اپنے خار پیوستہ سینہ سے نغمہ سنجی کیا کی اور سرد بلوریں مہتاب جھکا ہوا داد نغمہ سنجی دیتا رہا۔ بلبل تمام رات گایا کی اور کانٹا اس کے سینہ میں گہرا اترتا رہا اور اس کا خون حیات ایک جذبہ بلا مد ہو کر بہہ نکلا۔

اس نے (سب سے پہلے) ابتداً ایک لڑکے اور لڑکی کے دل میں پیدائش محبت کا گیت گایا۔ شجر گل کی سب سے بالائی شاخ میں ایک عجیب و غریب پھول نمودار ہوا اور تواتر نغمہ کے ساتھ ساتھ پنکھڑی پہ پنکھڑی تمام ہوتی گئی۔ شروع میں وہ پھول زرد تھا جس طرح کہر دریا پہ چھائی ہوتی ہے۔ زرد جیسے صبح کے باز و جس طرح ایک آئینہ سیمیں میں انعکاس گل ہوتا ہے یا کسی چشمہ بلوریں میں گلاب سایہ نگن ہوتا ہے اسی طرح بالکل اسی طرح یہ گلاب بھی اپنی بالا ترین شاخ درخت میں پھول رہا تھا۔

لیکن وہ شجر گل عندلیب سے مخاطب ہوا کہ اپنے سینہ کو کانٹے سے نزدیک تر کر دے پیوستہ تر کر دے اے بلبل" درخت پکارا" ورنہ طلوع صبح تکمیل گل سے قبل ہو جائے گا۔

چنانچہ بلبل نے اپنے سینہ کو کانٹے کی طرف اور بڑھا دیا اور اس کا نغمہ بلند سے بلند تر ہوتا گیا کہ وہ اس وقت ایک نوجوان اور ایک دوشیزہ کے دل میں پیدائش محبت کا گیت گا رہی تھی۔

گلابی رنگ کی ایک نازک سی جھلک اس پھول کی پنکھڑیوں میں آئی ایک ایسی جھلک آئی جو نوشہ کے چہرے پر اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ اول بار عروس کے لبوں کو بوسہ دے۔ لیکن ابھی تک کانٹا اس کے وسط دل میں نہیں پہنچا تھا۔ چنانچہ قلب گل بھی ہنوز سفید تھا کیونکہ صرف ایک بلبل کا خون دل ہی ایک پھول کے قلب کو رنگین بنا سکتا ہے۔

وہ "شجر گل" عندلیب سے مخاطب ہوا کر اپنے سینہ کو کانٹے سے نزدیک تر کردے "پیوستہ تر کردے اے بلبل" درخت پکارا "ورنہ طلوعِ صبح تکمیلِ گل سے قبل ہو جائے"۔

چنانچہ بلبل نے اپنے سینہ کو کانٹے کی طرف اور بڑھا دیا اور کانٹا اس کے دل میں بیٹھ گیا اور ایک بے رحم درد اس کی ہر رگ و پے میں دوڑ گیا جس قدر اس کے درد کی شدت بڑھتی جاتی تھی۔ اسی قدر اس کا اضطرار نغمہ بڑھتا جاتا تھا۔ کیونکہ اس وقت وہ اس محبت کا نغمہ گا رہی تھی جس کی تکمیل موت کرتی ہے، اس محبت کا نغمہ جو قبر کے اندر بھی مر نہیں جاتا۔

وہ عجیب و غریب پھول مشرقی آسمانوں کے گلاب کی مانند سرخ ہو گیا پنکھڑیاں سرخ تھیں، اور سرخ تھا قلبِ گل، جیسے عقیق۔

لیکن صدائے عندلیب پست تر ہو گئی تھی اور اس نے اپنے بازو پھڑ پھڑانا شروع کر دیئے تھے اس کی آنکھوں پر ایک پردہ سا چھا گیا تھا اس کا نغمہ پست سے پست تر ہو گیا اور اس کے گلے میں پھندا سا پڑتا ہوا معلوم ہوا۔

اب اس سے ایک آخری بقعۂ نغمہ پیدا ہوا، ماہ سیمیں نے اس کو سنا اور صبح کو فراموش کر بیٹھا اور آسمان پر پاؤں ٹکتا رہا۔ اس احمریں گلاب نے بھی اسے سنا اور وجد میں ہمہ تن رعشہ ہو گیا اور نسیم صبح گاہی کے لئے اپنی پنکھڑیاں کھول دیں۔ صدا اس کو پہاڑیوں کے اندر اپنے غار ہائے ارغوانی میں لے گئی اور راعیانِ خوابِ آسودہ کو بیدار کر دیا۔ وہ ندیوں کی نے نوازی میں بہا اور انہوں نے اس کا پیغام سمندر کو پہنچا دیا۔

"لے دیکھ" "شجر گل پکارا "پھول مکمل ہو گیا" لیکن بلبل نے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ وہ خار پیوستہ بدل گھاس پر مردہ پڑی ہوئی تھی۔

دن چڑھے طالب علم نے کھڑکی کھولی اور باہر نظر ڈالی۔

"کیا خوب خوش قسمتی کا ایک حیرت ناک ماجرا" اس نے ایک چیخ ماری "سرخ گلاب تو یہ رہا۔ میں نے اپنی ساری عمر میں کبھی ایسا گلاب نہیں دیکھا" وہ بیتابانہ جھکا اور پھول توڑ لیا......

"عکاس"

مضامین سے قطع نظر نقاد کے نئے پرچہ میں ریاض خیر آبادی جلیل مانکپوری اور

حسرت موہانی کی غزلیں اور مانی جائسی و سیماب اکبرآبادی کی نظمیں بھی شامل ہیں۔ غزلیں تینوں عاشقانہ رنگ کی ہیں۔ مانی جائسی کی نظم "مجبور پپیہا" اور سیماب کی نظم "حیات مشترک" بھی عشقیہ جذبات سے تعلق رکھتی ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ نقاد کا پورا پرچہ کیا نظم کیا نثر حسن و عشق اور نیاز و ناز کے تخیلی پیکروں کا البم ہے اور یہ البم نقاد کے مدیر دلگیر نے اپنی افتادِ طبع کی موافقت سے قمر زمانی کی خوشنودیِ مزاج کے لئے جان بوجھ کر تیار کیا ہے۔ یہ پرچہ کیا ہے قمر زمانی اور دلگیر کی داستانِ معاشقہ کی منہ بولتی تصویر ہے۔ دلگیر نے اس پرچے کو بڑے چاؤ سے قمر زمانی کے ملاحظہ کے لئے بھیجا اور ان سے رائے بھی طلب کی۔ غالباً قمر زمانی اس کے مطالعے میں لگ گئیں یا کسی اور وجہ سے کچھ دنوں کے لئے خاموش ہو گئیں۔ دلگیر کا اضطرابِ شباب کو پہنچ چکا تھا۔ انہوں نے اپنے پچھلے خط مرقومہ ۴ ر اپریل کے ساتھ قمر زمانی کو نقاد کا پرچہ بھیجا تھا۔ صرف دو دن انتظار کر سکے ۱۶ ر مارچ کو پھر ایک خط اس طرح پر لکھا:

۱۶ ر اپریل ۱۷ء

ماہِ التفات

روحی فداک۔ خدا جانے کیا بات ہے کہ آپ کے خط کا جواب ۴ ر کو لکھنے کے بعد سے خود بخود جی بھر آتا ہے۔ روتا ہوں مگر تسکین نہیں ہوتی۔ ہائے یہ مجھ کو کیا ہو گیا ؎

جان برباد کرم ہے دلِ تباہِ التفات

کل کی رات جس کی صبح کو یہ خط لکھ رہا ہوں آنکھوں میں کٹ گئی ؎

"چاند یہاں بھی نظر نہ آیا"

اپنی حسرت کی داد کس سے لوں

نہ معلوم کیوں رات نیند نہ آئی۔ مر مر کے صبح ہوئی بس وہی افسردہ کلی پیشِ نظر تھی جس نے آپ کے دھڑکتے ہوئے سینہ پہ ایک رات بسر کی تھی رہ رہ کے خیال آتا تھا۔

"مجھ سے تو وہی کلی اچھی"

اس خیال سے کلیجہ میں ہوک اٹھی۔ دل کی بے تابی بڑھتی اور یہ نالے خود بخود موزوں ہو گئے۔ افسوس جن کی داد دینے والا ابھی یہاں موجود نہیں۔ آپ کے پاس اصلاح کی غرض سے بھیجتا ہوں۔ خدا کے لئے کہیں ان پر اپنا نازک قلم لگا دینا آبرو بڑھ جائے گی۔

جی نہیں چاہتا ختم کروں مگر سمع خراشی آخر کہاں تک کیجیے آداب، اب جاتے ہیں۔

ہلاکِ آرزو

"دگیر"

ان دنوں دل کی بے تابی کا یہ عالم ہو رہا تھا کہ دگیر سے صبر و ضبط کا دامن چھوٹتا جا رہا تھا وہ دل کو لاکھ سنبھالتے مگر قابو میں نہ آتا قمر زمانی کی محبت نے انہیں دیوانہ بنا رکھا تھا۔ قمر زمانی ان کے خط کا جواب دیں یا نہ دیں وہ برابر انہیں لکھے جا رہے تھے چنانچہ ۱۶ راپریل کے خط کے بعد انہوں نے دوسرے دن ۱۷ ر کو بھی ایک خط قمر زمانی کو لکھا۔ یہ خط بھی خاصا طویل ہے اور ایک ایک لفظ سے دگیر کی طبیعت کا اضطراب نمایاں ہے خط دیکھیے :۔

۱۷ راپریل ۱۷ء

تمنا کو تم اپنی منع کر دو۔ ہماری جان کے پیچھے پڑی ہے۔

آج ہاں آج، غالب توقع تھی پوری امید تھی کہ آپ کا مسیحا نامہ ملے گا لیکن آہ نہ ملا۔ کیا بتاؤں غم نصیب جی پر کیا گزر گئی۔ ہائے خدا کسی کو امیدوار نہ کرے۔

خط کا جواب نہ سہی کم سے کم نقاد کی رسید فوراً دینی تھی۔ پرسوں رات سے بُرا حال ہے۔ خبر نہیں کیوں۔ کل کی رات بھی جیسی گزری، الاماں بیان کر کے آپ کو آزردہ کرنا نہیں چاہتا۔ ہاتھوں پہ ساری رات دلِ ناصبور تھا۔ یہ اضطراب شبی میں یہ شعر ادا ہو گئے جو بہ نظر اصلاح بھیجتا ہوں ؎

یادِ ایام کہ مر مر کے کٹی ہجر کی شب
جو گزر جائے کسی پہ وہی حال اچھا ہے
گو نہ آئے مری بالیں پہ دمِ نزع یہاں
خیر پوچھا تو سہی تم نے کہ حال اچھا ہے
نہ خوشی جینے کی مجھ کو نہ ہے مرجانے کا غم
آپ جس حال میں رکھیں وہی حال اچھا ہے
لکھی دگیر نے خاطر سے قمر کی یہ غزل
اس کو جو حال پسند آئے وہ حال اچھا ہے [۱]

---

[۱] : دگیر نے ۱۶ راپریل کے خط میں اس غزل کے کچھ اشعار قمر زمانی کو لکھ کر بھیجے

پہلے مقطع میں صرف آپ کے لئے صرف یہ ترمیم کر دی ہے ؎

وہی اچھا ہے کہ ہے جس میں قمر کی مرضی
ہجر اچھا ہے نہ دلگیر وصال اچھا ہے [2]

رات تو یوں ہی گذر جاتی ہے اور دن بھر وہ کلی [3] دیکھتا رہتا ہوں جسے آپ نے کاغذی پیرہن دے کر حیات ابدی بخش دی ہے۔ اس غریب کی دل گرفتگی و دلگیری کو دیکھ کر طبیعت بے قابو ہو جاتی ہے بے اختیار رو دیتا ہوں۔ سارے آنسو کلی پر گرتے ہیں جن کی نمی شاید اسے کبھی شگفتہ و شاداب کر سکے۔

کیا کوئی ایسی صورت نہیں کہ میں بریلی حاضر ہو کر ایک نظر آپ کو دیکھ لوں۔ خدا کے لئے صاف صاف لکھو بے چین ہوں آگرہ تو آپ کیوں آنے لگیں۔ کیا آپ کی کوئی تصویر ہے۔ ہو تو اسی کو بھیج دیجئے۔ غم غلط ہو جائے گا۔ اچھا یہ بھی نہ سہی اپنا رومال ہی میرے آنسو پونچھنے کے لئے بھیج دیجئے ابھی ابھی ایک ہچکی آئی شاید آپ نے یاد کیا ہے ؎

اتنا نہیں کوئی آنسو پونچھے
کیا روؤں میں اپنی بے کسی کو

"حسن" [4] کا بے صبری و شوق کے ساتھ منتظر ہوں۔ خدا جانے کس قیامت کا ہوگا (کہہ دیجئے کسے خبر ہے) شاید میں اس آئینے میں آپ کو دیکھ سکوں جس کی بڑی تمنا ہے۔ فرصت ہو اور جی بھی چاہے تو "مہندی" یا "اتری"

---

[1] یہ اشعار اسی غزل پر اضافہ اور بعض اشعار کی ترمیم و اصلاح کی حیثیت رکھتے ہیں دلگیر نے یہ غزل قمر زمانی کی زمین میں کہی ہے۔ قمر زمانی کی غزل پچھلے صفحوں میں ہم ان کے خط مرقومہ ۱۳ اپریل کے ساتھ نقل کر چکے ہیں۔ یہ نقاد بابت مئی ۱۹۱۷ء میں شائع بھی ہو چکی ہے قمر زمانی چونکہ یہ پسند نہ کرتی تھی کہ دونوں کی غزلیں ایک ہی پرچے میں ساتھ ساتھ شائع کی جائیں۔ اس لئے دلگیر نے اپنی غزل مئی کے بجائے جون کے پرچے میں الگ "نالہ مجبور" کے نام سے شائع کی۔ ملاحظہ ہو نقاد بابت جون ۱۹۱۷ء ص ۴۲؛

[2] پہلے مقطع میں "قمر" کی جگہ "کسی" تھا نقاد میں یہ مقطع پہلی ہی صورت میں چھپا ہے۔

[3] قمر زمانی کے مضمون "اے کلی" کی طرف اشارہ ہے جو اس سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔

[4] مضمون جسے بھیجنے کا قمر زمانی نے اپنے گذشتہ خط میں وعدہ کیا تھا۔

ہوئی "مہندی" پہ کچھ لکھ ڈالئے کہ یہ آپ کا حصہ ہے۔ جان دینے کے لئے
ہیں حاضر ہوں۔

تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

دل ہے تمہارا
"دنگیر"

قمر زمانی نے کچھ دنوں کی خاموشی کے بعد دنگیر کو خط لکھا اور ان کے دوسرے خطوط سے اعتراض کر کے صرف ۷ر اپریل کے خط کو سامنے رکھا۔ ۷ر اپریل کے خط میں دنگیر نے کبوتر کے ایک جوڑے کی خوش نعلیوں کا ذکر کیا تھا اور نقاد کے تازہ پرچے کے بارے میں قمر زمانی کی رائے مانگی تھی۔ قمر زمانی نے اس کے جواب میں دنگیر کو لکھا۔

۱۷ر اپریل ۱۷ء
"جانِ قمر"

اس وقت تک آپ کی جتنی تحریریں آئی ہیں ان میں ایک تحریر ۷ر اپریل کی ایسی ہے جس کو نہ میں اچھی طرح پڑھ سکی اور نہ ہمت کہ پڑھوں۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ یہ خط اس فائل میں شامل نہ ہو سکے گا جس کو میں جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہوں۔ یہ آپ کو بعض وقت کیا ہو جاتا ہے لاحول ولا قوۃ۔

نقاد دیکھا ہائے اللہ! مگر یہ "نازک خیالوں کا ست کھینچ لینا" کیا معنی۔ اللہ آپ کے جوش سے بچائے۔ آپ کو یہ بھی ہوش نہ رہا کہ اس میں میری کتنی سخت توہین آپ نے کی ہے۔ ذرا غور فرمایئے۔

"جانداریت"[1] ایک جدا صفحے پر ہونی چاہیئے تھی اور جلی قلم سے اب تو وہ بالکل اشتہار معلوم ہوتا ہے۔ میرا مضمون بلاک سے تو چھپا نہیں پھر یہ کیا طریقہ ہے؟ کیا آپ ہی کے پریس میں تیار ہوا ہے۔ مگر خوب ہے۔ شرر کا مضمون تو مجھے پسند نہیں آیا۔ بالکل خشک ہے۔ مگر نیاز نے قیامت کر دی۔ میری طرف سے انہیں مبارک باد دیجیئے یا مجھے پتہ لکھئے کہ میں انہیں خود لکھوں۔ "عکاس" بھی خوب ہیں مگر یہ شاید ترجمہ ہے کسی انگریزی مضمون کا۔ خلیقی کا مضمون کاش فصیح بھی

---

[1] : قمر زمانی کا مضمون جسے دنگیر نے اپریل ۱۷ء کے نقاد میں اپنے مضمون "افتتاحیہ" کے وسط میں جگہ دی تھی۔

ہوتا۔ نیاز صاحب کی دونوں کتابیں جن کا اشتہار آپ نے دیا ہے میرے پاس بھیج دیجیے۔ لفظ "نقاد" شروع صفحہ پر برا لکھا ہے۔ عربی خط میں بہت خوبصورت ہونا چاہیے۔ آئندہ اپنے نام کے ساتھ مہربانی فرماکر شاہ کا لفظ نہ رکھیے بہت بھدی بات ہے اور کم از کم ایک لٹریری پرچے کے لئے سخت ناموزوں ہے۔ آیت میں ایک جگہ اعراب غلط ہے "رحم" بکسر حائے ہونا چاہیے کتابت کی غلطی ہے اس کو درست کرا دیجیے۔ اس سے آپ پر الزام عاید ہوتا ہے۔ مضمون و غزل آپ کے پاس پہنچ ہی گئے ہیں۔ آخیر مئی میں ایک بڑی خوشخبری سننے کے لئے تیار رہیے۔

آپ کی

"قمر"

دگیر کو قمر زمانی کا یہ خط جیسے ہی ملا۔ دگیر نے اس کا جواب دیا اور قمر زمانی کے اٹھائے ہوئے سارے سوالات کو زیر بحث لائے۔ دگیر کا اصل خط دیکھیے:۔

۲۰ر اپریل ۱۷ء

'جان دگیر'

سلامت رہو دعائے نیم شبی قبول ہوئی وہ خط جس کے لئے بیتاب تھا بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگایا۔ دل میں رکھا۔ لاحول ولا قوۃ آپ بھی سچ سمجھ گئیں اے حضور وہ تو (ادبی) اپریل فول تھا۔

کچھ میرے پریشان خطوں کا فائل رکھا جاتا ہے ان سب کو پھاڑ ڈالئے۔ جلا دیجیے۔ وہ مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے ان میں کتنے خط ایسے ہیں جن کا فائل رکھا جا سکے۔ قسم لو۔ ایک نہیں۔

بے ہوش تو ضرور ہوں (اور خدا مجھے بے ہوش ہی رکھے) مگر اتنا ہوش ہے کہ میرے قلم سے آپ کی توہین نہیں ہوئی۔ یہ صرف کاتب نقاد کی عنایت ہے جس نے مجھے آپ سے شرمندہ کیا۔ میں نے اس طرح لکھا تھا۔

"لکھنے والی نے بڑے بڑے نازک خیالوں کا ست کھینچ لیا" کاتب نے علامات اوقات اڑا کر ذم کا پہلو پیدا کر دیا۔ مجھے صحت کے وقت اس کا خیال نہ رہا۔ میں سنا کرتا تھا۔

"علا فلاں پیرو نقط نہ شوند"

یہ غلط ثابت ہوئی۔

بہر تقدیر میری نیت آپ کی توہین کی ہرگز نہ تھی۔ نادانستہ جو توہین ہوگئی اس کی باادب معافی چاہتا ہوں اور اس غلطی کی تصحیح کرنے کے لیے حاضر ہوں جلد لکھیے کن الفاظ میں معذرت کروں۔

"جانداریتی" کو آپ مجھ سے جدا دیکھنا چاہتی تھیں۔ مگر یہ مجھ سے کسی طرح ممکن نہ تھا کہ میں اسے اپنی آغوش سے علیحدہ رکھوں۔ دل میں جگہ دی اور کہاں رکھتا۔

بے شک وہ اشتہار معلوم ہوتا ہے مگر اشتہار محبت ایک ادیب اور سخت کافر نقاد نے اس کی نسبت مجھے لکھا۔

"جانداریتی" اسی لوٹ اور اسی جگہ کی مستحق تھی جو آپ کو دی گئی حقیقت میں نقاد ہو۔ تمہارے انتخاب کا کیا کہنا خود منتخب ہو۔ اف کمال کر دیا۔"

آپ کا مضمون واقعی بلاک سے نہیں چھپا۔ اس بالغ نظری کی داد قبول فرمائیے۔ جب بلاک بننے میں دیر ہوئی تو میں نے لکھا کہ فوٹوز چھاپ کے بھیج دیں چنانچہ یہ اس طریقے سے چھپ کر آیا ہے۔ بلاک وقت پر بن جاتا تو چار چاند لگ جاتے۔ اس پر بھی پسند آیا۔ اپنے خلوص کی تعریف کیجیے۔ خوش ہوا کہ آپ نے مخلصانہ نقد و نظر سے مستفید فرمایا۔ اس طرح آپ ٹوکتی رہیں تو نقاد ایک دن میں کچھ ہو جائے گا۔ مضامین کی نسبت آپ کی رائے درست ہے۔

نیاز کو آپ کی طرف سے مبارک باد لکھ دی۔

گلاب آسکر وائلڈ کے مضمون کا ترجمہ ہے۔ خوب اندازہ کیا۔

گیتاں جلی۔ لطیفے سے لے کر اور "شاعر کا انجام" الہ آباد سے منگا کر روانہ کروں گا۔ صرف پبلشر صاحبان کی تحریک پر اپنی جانب سے اشتہار دے دیا ہے۔ کتابیں دونوں میرے پاس نہیں نقاد کا سرورق اکٹھا (چند ماہ کے لئے) چھپ گیا ہے۔ اس لئے مجبور ہوں۔ آئندہ سرورق پر نقاد عربی خط میں خوبصورت لکھواؤں گا۔

آپ "شاہ" کا لفظ نکلوا کر میری روحانیت مجھ سے چھیننا چاہتی ہیں بہت اچھا میں روحانیت بھی (جسے جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں) آپ پر قربان کر دوں گا۔ جب تک موجودہ سرورق باقی ہے "شاہ" پر چپی لگ

جائے گی اور نئے سرورق پہ صرف دل گیر ہو گا۔ آئندہ آپ کی خوشی ہوئی تو دگیر بھی مدارد صرف قمر ہی قمر۔

اعراب غلط ہے صحت ہو جائے گی۔ اس محبت آمیز انتباہ کا دلی شکریہ یہ "حسن" اب تک نہیں آیا۔ جلد بھیجئے۔ غزل بھی بعد اصلاح جلد آنی چاہیئے خوشخبری سننے کے لئے تیار ہوں۔ آہ ایسی تقدیر کہاں۔

اور مضمون ملاجسے بھیج رہا ہوں۔ شائع کرنے کی رائے ہو تو اپنے نوٹ کے ساتھ واپس فرمائیے۔ میرے اور خط ابھی تک لاجواب ہیں آہ۔

"دگیر"

دلگیر نے یہ خط ۲۰ اپریل کو پوسٹ کیا تھا۔ دو تین دن جواب کا انتظار رہا۔ جب قمر زمانی کا کوئی خط نہ ملا تو انہوں نے ۲۵ اپریل کو ایک خط ڈالا۔ یہ بھی عالم اضطراب میں لکھا گیا ہے اور خط سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے جذبہ عشق اور جنون میں تھوڑا ہی فاصلہ باقی رہ گیا ہے۔ اصل خط دیکھئے۔

۲۵ اپریل ۱۷ء

خط تجھ کو وہ لکھے جو تری یاد چھوڑ کر
دل محوِ فکر واپسیِ نامہ بر کرے

پیاری

بہت ستاتی ہو۔ خطوں کے جواب میں اتنی دیر۔ کل نہ مرا تو آج مر جاؤں گا۔ آپ یہ سن کر ہنسیں اور میں روؤں کہ ۲۳ اپریل کو جب آپ کا خط نہ ملا تو طبیعت میں الجھن پیدا ہوئی دل کی وحشت بڑھی اور مجھ سے کسی عنوان ضبط نہ ہو سکا۔ سیدھا اسٹیشن پہنچا ٹکٹ لیا اور روانہ ہو گیا۔ راستے میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ قلب میں پنکھے لگے ہوئے ہیں۔ خیر۔ دیار محبوب کے شوق میں رات کٹ گئی صبح ہوتے ہی بریلی میں تھا (یعنی ۲۴ کو) دن بھر اس پیارے شہر کی گلیوں کی خاک چھانتا پھرا۔ پہلے "ذخیرہ" گیا۔ پھر کے دروازے کو بوسہ دیا۔ سجدہ کیا اور الٹے پاؤں واپس آیا پھر اس تلاش میں ہر جگہ گیا کہ کسی طرح قمر منزل کا پتہ چل جائے تو وہیں پاؤں توڑ کے بیٹھ رہوں مگر تیرہ بختی ساتھ تھی ناکامی ہوئی۔ آپ کا کھوج نہ لگا۔ آہ مجھے اس دل کی بے تابی نے مارا۔ کہاں سے لاؤں اس آرام جان کو اپنی دیوانگی و شوریدہ سری کی داد

نہیں چاہتا۔ میں یہ سمجھ کر خوش ہوں ؎

میری ناکامیوں پر تم کو رحم آجائے گا آخر
مری امید میری سعی لاحاصل سے نکلے گی

خیال تھا کہ وہاں پہنچ کر تسکین ہو جائے گی مگر کچھ سکون نہ ہوا اختلاج اور بڑھا۔ اس وحشت کا یہ نتیجہ اضطراری تھا کہ رات گاڑی سے واپس آیا۔ راستے کی یادگار یہ شعر ہے جسے آپ بھی سن لیجئے ؎

یہ ترا تغافل جان گسل نہ کرے کہیں تجھے منفعل
کہ بہت ہی زار و شکستہ دل ترے در سے اہل وفا گئے

آج یہاں آکر بھی کوئی خط نہ پایا۔ اتنی دل شکستگی۔ کس سے کہوں۔ خدا مواقع بخیر کرے "حسن" اب تک نہ آیا۔ غزل کی اصلاح کون کرتا۔ رسید تک ندارد ناہید کے مضمون کے متعلق کوئی رائے نہیں۔ نوٹ نہیں۔ رسید نہیں اللہ رے استغنا۔ آپ کے پوچھنے والوں نے تنگ کر رکھا ہے کس کس کو جواب دوں مسز سجاد حیدر[1] کا خط آیا ہے جسے بجنسہ ارسال کرتا ہے ان کو خواہ براہ راست جواب دیجئے یا میری معرفت۔

آپ کو کیوں کر یقین دلاؤں کہ خط جلد نہ ملنے سے میری حالت تباہ ہو جاتی ہے۔ اپنے ہوش میں نہیں رہتا۔ نقاد کے کام میں بھی دل نہیں لگتا۔ اس لئے جس طرح ممکن ہے جلد جلد یاد فرماتی رہیئے اور مفصل ورنہ صبر آزما سکوت کسی دن میری جان لے لے گا۔ ہائے اللہ اخیر مئی کب آئے گا۔

بدستور
"دلگیر"

دلگیر کی بے تابی کا اندازہ اوپر کی سطروں سے لگایا جا سکتا ہے وہ قمر زمانی کی تلاش میں بریلی گئے اور واپس آئے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ بے تابی نے دیوانگی کا روپ دھارنا شروع کر دیا ہے۔ ایسی صورت میں وہ قمر زمانی کے جواب کا انتظار کیا کرتے۔ اس لئے یکے بعد دیگرے خطوط لکھتے رہے۔ چنانچہ ۲۵ ر کے بعد ۲۸ ر کو انہوں نے پھر ایک خط ڈالا اور صرف اس قدر لکھا۔

---

[1] : سجاد حیدر یلدرم کی بیگم نذر سجاد حیدر۔

۲۸/اپریل ۱۷ء

آہ۔

سینہ خانہ رہی ہے اور وہی سوزِ غم فرقت
مرے کس کام آیا آپ کا رشکِ قمر ہونا

آزردہ

دگیر

تین دن جواب کا انتظار کر کے ۲/مئی کو پھر قمر زمانی کو لکھا۔

۲/مئی ۱۷ء

اے عیسیٰ بیماران از ہجر تو رنجورم
شاید نہ خبر داری از حالتِ بیمارے

آنکھوں میں بسنے والی۔ دل میں سمانے والی۔ تجھ پر سلام۔ ہائے! خدا جانے آپ کیسی ہیں۔ کس حال میں ہیں کہ اب تک سوادِ خط سے آنکھیں پر نور نہیں ہوئیں۔

گوش مہجورِ پیام و چشم محروم جمال
ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

کم سے کم اپنی خیریت تو لکھیے۔ یہ بدنصیب آنکھیں جس طرح آپ کے خط کو روزانہ ڈھونڈتی ہیں انہیں سے پوچھیے۔ آہ میری حالت کون دیکھے

وہ بے کسی ہے کہ پرسانِ حال کوئی نہیں
تھا ایک دل وہ تمہارا ہی جاں نثار ہوا

خیر پیاری۔ تم سلامت رہو۔ میں ایک ارادہ کر چکا ہوں اور وہ جلد پورا ہوگا

جب سے مرنے کی جی میں ٹھانی ہے
کس قدر ہم کو شادمانی ہے

جان سے بیزار

دگیر

قمر زمانی نے ۱۷/اپریل کو ایک خط لکھا تھا اور نقاد کے تازہ پرچے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ ساتھ ہی دگیر کو اپنے نام سے "شاہ" کے لفظ کو ہٹا دینے اور نقاد کو مزید صحت کے ساتھ شائع کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ دگیر نے ان کے

اس خط کا جواب ۲۰ر اپریل کے خط میں دیا تھا لیکن قمر زمانی اس کے بعد دانستہ خاموش ہوگئیں تھیں۔ جب دلگیر کے کئی خط ان کے پاس پہنچ گئے تو انہوں نے ۳۰ر اپریل کو مندرجہ ذیل خط لکھ کر کئی خطوں کے جواب کی تلافی کر دی۔

۳۰ر اپریل ۱۷ء

آپ کے تین خط ۱۴ر، ۱۶ر اور ۲۰ر کے پہنچے۔ معاف فرمایئے گا۔ جواب میں غیر معمولی دیر ہوئی۔ میں سخت علیل ہو گئی تھی اور اب بھی بستر علالت پر ہوں۔ مختصراً ہر ایک خط کا جواب لیجئے۔

۱۴ر کا خط ــــ آپ نے میری "کلی" کو پسند فرمایا، شکریہ۔ قبول کیجئے۔ اور غزل کو بھی۔ مکرر شکریہ۔ میں نے قصداً "پژمردہ کلی" لکھا ہے دلگیر کا لفظ میں نے عمداً ترک کر دیا لیکن آپ کی مسرت کے لئے یہ کافی ہے کہ اس وقت میرے ذہن میں یہ لفظ اور اس لفظ کا مسمیٰ دونوں تھے اس میں اصلاح نہ دیجئے گا۔ پژمردہ کا لفظ بدستور رکھئے گا۔ اپنے مضمون کی تعریف میں خود لکھوں، قیامت تک ممکن نہیں۔ خدا کے لئے آپ ایسے معاملے میں اصرار نہ کیا کیجئے۔

۱۶ر کا خط ــ دیکھئے یہاں آنے کا قصد اس وقت تک نہ کیجئے گا جب تک میں خود نہ لکھوں۔ خدا کے لئے ذرا صبر سے کام لیجئے۔ آخر یہ کیا وقت ہے۔ "دیوان حسرت" بھیج دیجئے ریویو کروں گی اگر کر سکی۔ بیگم حسرت کو آپ نے جواب اچھا نہیں دیا۔ آخر اس شعر کے لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ دیکھئے آئندہ سے احتیاط رکھیئے کہ کسی تحریر میں جو دوسرے کی نگاہ سے گزرنے والی ہو کوئی بات کبھی ایسی نہ لکھئے کہ کوئی شک پیدا ہو۔ آپ مری غزل کے ساتھ شائع نہ کریں یا پھر میری غزل کو روک لیجئے اس کی بھی وہی وجہ ہے پھر بھلا میری غزل اس کے سامنے کیا اچھی معلوم ہوگی۔

۲۰ر کا خط ــــــ میں اس قدر بیوقوف نہیں کہ آپ کی اس تاویل کا یقین کر لوں اگر وہ ادبی اپریل فول تھا تو سخت نامعقول تھا۔ معاف کیجئے اگر آپ کا مذاق ادب یہی ہے تو حضرت میرا سلام ہے۔ آہ دلگیر میں کس کو سمجھاؤں کہ میں کیا چاہتی ہوں اور آپ سے کیا توقع رکھتی ہوں۔ ایسی بازاری بات تو بازاری عورت

کو بھی اچھی نہ معلوم ہوگی۔ آپ نے مجھے اس سے بھی زیادہ گیا گزرا سمجھ لیا۔
آپ کی دوسری تاویل صرف آپ کی جدت ہے اور کچھ نہیں بجا ہے کاتب نے غلطی کی۔ میں کہتی ہوں اگر کاتب نازک خیالوں کو الگ الگ بھی لکھتا تو کیا ذم کا پہلو دور ہو جاتا۔ ملا کر پڑھنے سے بدستور باقی رہتا اور پھر اس کو جلنے دیجئے محض ست کھینچ لینا۔ یہ لفظ بھی بھدہ ہے۔ خاص کر جب آپ کسی عورت کے لئے لکھیں آپ کو بیس لفظ اور مل سکتے تھے لیکن جب آپ کو جوش میں کچھ پتہ چلے اب آپ اس غلطی کی صحت کر کے مجھے اور ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اس پر اور طرہ ہے۔ معقول۔ وہ آپ کا ادیب اور سخت نقاد کون ہے جس نے "چاندارتی" کے محل اندراج کو پسند کیا۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ بد مذاق اور کوئی نہیں معاف کیجئے میرے لئے ایسے بے حس لوگوں کی رائے سند نہیں ہو سکتی۔ اگر "شاہ" کے لفظ سے آپ کی روحانیت کا اعلان اس طور پر کیا جاتا ہے۔ میں نے تو سنا تھا کہ روحانیت کا تعلق صرف اعمال سے ہے۔ اقوال سے نہیں۔ یہ نیا انکشاف ہے "حسن" نصف ہو کر رہ گیا ہے۔ ذرا صحت ٹھیک ہو تو پورا کروں۔ معاف کیجئے گا۔ یہ خط غصہ کی حالت میں لکھا ہے۔ اگر خلاف شان کوئی بات ہو تو برا نہ مانئے گا۔
آخر مئی کا انتظار کیجئے اور نہایت بے صبری ہے۔ ہاں ناہید کا مضمون درج کر دیجئے۔ میں نے نوٹ لکھ دیا ہے، جو میری طرف سے شائع ہوگا اور ان کا خط درج کرا دیجئے اور میرا جواب بھی ان کا خط اور مضمون دونوں واپس کرتی ہوں۔"

آپ کی
قمر

قمر زمانی کا یہ خط جیسے ہی دلگیر کو ملا۔ انہوں نے اس طور پر اس کا جواب دیا۔
۳ر مئی ۱۷ء

سرکار

عتاب نامہ ملا۔ پڑھ کر اپنے حال میں نہ رہا۔ غصہ رہ بھی بیمار کا۔ کیونکر برداشت کروں۔ آپ کی علالت سے جی نڈھال ہو گیا۔ آہ تیمارداری اور مزاج پرسی کیسے کروں۔ صرف دعا کرتا ہوں خدا قبول کرے۔ علالت کی وحشت

نہ معلوم ہونے سے اور وحشت ہے۔

میں اور آپ کے مضمون میں کسی جگہ اصلاح دوں ع

یہ تاب یہ مجال یہ طاقت کہاں مجھے؟

"دلگیر" صرف آپ سے اظہار شوق کے لئے لکھ دیا تھا۔ آپ کا مضمون بجنسہ لکھا گیا۔ بیگم حسرت کو اچھا جواب نہ دے سکنے پر شرمندہ ہوں۔ آئندہ احتیاط رکھوں گا، غزل پسند آئی، حسن نظر کی داد قبول فرمایئے میں نے اپنی غزل روک لی اجازت ہوگی تو شائع کروں گا ورنہ نہیں۔

میں اپنی تاویلات منفعل پر سخت نادم و پشیمان ہوں اور گذشتہ بے ادبیوں کی بادب معافی چاہتا ہوں۔ اب ایسی خطائیں نہ ہوں گی۔

میں روحانیت کا زبانی دعویٰ واپس لیتا ہوں اور غلط اظہار خیال پر منفعل ہوں آئندہ "شاہ" نہ رہے گا۔

آہ میری شان! مجھ بیچارے کی شان ہی کیا

ناہید کا خط اور مضمون واپس ملا۔ جواب اور نوٹ کی تعریف کرنے کی قابلیت مجھ میں نہیں ہے۔

نذر سجاد کو آپ نے جواب لکھ دیا؟

کیا ۱۷، ۲۵ اور ۲۸ اپریل اور ۲ مئی کے خطوط آپ کو نہیں ملے۔ ممکن ہو تو خیریت روزانہ لکھتی رہیے۔

معتوب و شرمسار

"دلگیر"

دلگیر کے اس خط میں ناہید کے جس مضمون اور خط کا ذکر ہے وہ بھی فرضی نام سے لکھے گئے ہیں یعنی ناہید نام کی کسی ادیبہ کا وجود نہ تھا بلکہ نیاز فتح پوری ہی نے ناہید کے فرضی نام سے ایک مضمون بہ عنوان "میرا افسانہ حیات" اور مدیرہ کے نام ایک خط نقاد میں اشاعت کے لئے بھیجا تھا۔ یہ دونوں چیزیں مئی ۱۷ء کے نقاد میں شائع ہوئی ہیں۔ ناہید کا خط دیکھتے چلئے۔

ایک خط

کہیں سے

۱۸ اپریل ۱۷ء

جناب ایڈیٹر صاحب، آداب عرض!

میں نقاد کو الزام دوں یا قمر زمانی کے مضمون کو کہ میں بے اختیار ہو گئی اور یہ اپنا فسانہ آپ کے پاس بھیج رہی ہوں۔ آپ یقین کریں کہ جو کچھ لکھ رہی ہوں وہ میری سچی سرگذشت ہے اور نہیں کہہ سکتی کہ کس چیز نے مجھے اس کے اظہار پر مجبور کر دیا۔ میرا دعویٰ یہ نہیں کہ اس مضمون میں آپ کچھ ادبی حسن بھی پائیں گے اور نہ اس لحاظ سے اس کی اشاعت چاہتی ہوں۔ بلکہ خیال یہ ہے کہ شاید یہ میرا افسانہ "درد" کسی ایک دل کو متاثر کر سکے۔ وارفتگی نے اس قابل نہیں چھوڑا کہ مضمون تمام کر سکتی پہلا جزو پیش کرتی ہوں، دوسرا اس کی اشاعت کے بعد فی الحال میں مناسب نہیں سمجھتی کہ یہ مضمون واقعی میرے نام سے شائع ہو۔ شاید پھر کسی وقت ممکن ہو۔ میرا فرضی نام "ناہید" ہوگا۔

قمر زمانی صاحبہ کون ہیں اور میں ان سے کسی وقت خط و کتابت کر سکوں گی۔ یہ اطمینان رکھئے کہ نقاد کو میں دیکھ لیتی ہوں۔ اس کا جواب میں آپ سے چاہتی ضرور ہوں مگر نقاد ہی پیغامبر بنے تو خوب ہو اور وہی ہماری خط و کتابت کا ذریعہ سمجھا جائے۔ اگر آپ چاہیں تو اس خط کو بھی شائع کر سکتے ہیں اور ساتھ ہی اپنا جواب بھی۔ مگر میرا اصلی نام نہ ہو[۱]

(ناہید)

اس خط کا جواب نقاد کی جائنٹ ایڈیٹر قمر زمانی نے اس طور پر دیا۔

"آپ کے الزام کی نقاد کو قدر ہے کہ اس سے زیادہ بہتر طریقہ نقاد کی عزت افزائی کا اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ آپ کا انکسار ہے جو آپ اپنے مضمون کو ادبی حسن سے معرا پاتی ہیں۔ آپ نے ماشاء اللہ خوب لکھا ہے اور مجھے حیرت ہے کہ آپ کیونکر لکھ سکیں۔ بہتر ہے آپ کا نام شائع نہ ہوگا لیکن کم از کم آپ مجھے تو اپنے صحیح پتہ سے مطلع فرمایئے کہ میں خود آپ سے خط و کتابت کر دوں۔ میرا پتہ بذریعہ نقاد آگرہ ہے۔"[۲]

"قمر"

---

[۱]: نقاد ص ۸۷ بابت مئی ۱۹۱۷ء

[۲]: نقاد ص ۸۷ بابت مئی ۱۹۱۷ء

اس پرچے یعنی مئی ۷۱ء میں قمر زمانی کا انشائیہ "اے کلی" اور ان کی غزل جس کا مطلع ہے ؎

نزع میں بھی مری جانب سے خیال اچھا ہے
دم نکلتا ہے وہ کہتے ہیں کہ حال اچھا ہے

بھی شائع ہوئے ہیں۔

دلگیر کا خط مرقومہ ۴ مئی جو ابھی آپ کی نظر سے گزرا لاجواب رہا۔ قمر زمانی نے دانستہ چپ سادھ رکھی تھی۔ دلگیر کے لئے یہ خاموشی جان لیوا تھی۔ اس لئے انہوں نے ایک ہفتہ کے انتظار کے بعد دوسرا خط اس طور پر لکھا:

۱۱ مئی ۷۱ء

مجھ سے خفا ہو جانے والی
کیا اب یہ خفگی دور نہ ہوگی:

بے دل ہو تو آؤ مجھ سے دل لو
روٹھی ہو گلے لگاؤں مل لو

متواتر خطوں کا جواب نہیں نہ سہی۔ خیریت تو لکھی ہوتی صبر آتا۔ ۹ مئی کو گیتانجلی بذریعہ رجسٹری روانہ کی ہے۔ جی چاہے تو رسید دیجئے۔ "شاعر کا انجام" ابھی الہ آباد سے نہیں آیا جس وقت آئے گا اسی وقت روانہ کر دوں گا۔ دیوان حسرت بھی اس کے ساتھ ہو گا۔ علی گڑھ سے خاص نسخہ آپ کے لئے منگایا ہے۔

تیسرے نمبر کی کتابت "حسن" کی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔ آپ بھیجیں تو شروع ہو۔ میں "حسن" کو اس نمبر کا عنوان اولین بنانا چاہتا ہوں جس طرح ممکن ہو فوراً ارسال فرمایئے اور کوئی غزل بھی۔

اس طرف لکھئے:

کلی کی تقریب لکھی ہے جب مجھے ہی پسند نہیں[1] تو آپ کو کیا پسند آئے گی۔

میں کیسا ہوں۔ نہ پوچھئے۔ ہائے ؎

مٹنے والے ولولوں کی کار فرمائی نہ پوچھ
یاس اور امید کی ہنگامہ آرائی نہ پوچھ

---

[1] : قمر زمانی کا مضمون "اے کلی" اور دلگیر کی "تقریب" مطبوعہ مئی ۷۱ء پچھلے صفحوں میں نقل کی جا چکی ہیں۔

ہجر میں کیا کیا ہوں وقفِ ناشکیبائی نہ پوچھ
کاوکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

اگر اس خط کا جواب اور "حسن" نہ آیا تو پھر تکلیف نہ دوں گا۔

اپنی جان سے خفا

"دلگیر"

دلگیر کا یہ خط ابھی راستے ہی میں تھا کہ ادھر سے قمر زمانی بیگم کا خط آپہنچا۔ اس خط میں قمرِ زمانی نے دلگیر کے کئی خطوں کا جواب بڑی خوبصورتی سے چکا دیا ان کا خط دیکھیے:۔

حافظ عزیزالدین نقشبندی

ذریعہ پوسٹ ماسٹر دہلی

پیارے دلگیر خدا کی قسم اور آپ کے سر کی قسم کہ میں اس زمانے میں سخت پریشان رہی۔ اپنی بیماری کی خبر پہلے دے چکی ہوں اور اب یہ سنئے کہ میں بریلی سے ایک خاص ضرورت سے مجبور ہو کر بنارس گئی اور وہاں سے لکھنؤ ہوتی ہوئی دہلی آئی ہوں۔ ہاں وہی دہلی جہاں سب سے پہلے یہ آزار مجھے لگا۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کے کون کون سے خطوط مجھے ملے اور کون کون نہیں۔ بہرحال معافی چاہتی ہوں اور آئندہ کے لئے وعدہ کرتی ہوں کہ بہت جلد جواب دیتی رہوں گی۔ میرا پتہ نوٹ کر لیجئے۔ بڑی مشکل سے یہ تدبیر نکالی ہے لفافہ کے اوپر میرا نام نہ ہو صرف حافظ عزیزالدین کا ہونا چاہیے اور اس کے اندر جو دوسرا لفافہ ہو اس پر صرف ق۔ز ہونا چاہیے۔ اس کے بعد میں اور زیادہ محفوظ طریقہ بتاؤں گی۔ میں اس وقت عجلت میں ہوں اس لئے پوری کیفیت عرض نہیں کر سکتی "حسن"[1] اب پورا کر دوں گی۔ نقادمیں کیوں دیر ہوئی آپ خفا تو نہیں ہو گئے۔ دیکھیے اس کا ضرور لحاظ رہے کہ بغیر میرے بلائے ہوئے آپ کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ فرمایئے گا۔ آپ کو کیا خبر کہ میں کس طرح آپ سے یہ خط و کتابت بھی کر لیتی ہوں۔ آپ مطمئن رہیں جون آنے دیجئے پھر ایک جگہ بیٹھ کر باتیں کریں

---

[1]: مضمون کی طرف اشارہ ہے جسے مکمل کر کے بھیجنے کا وعدہ قمر زمانی نے پچھلے خطوں میں کیا تھا۔

گے۔ میری کوشش ہے اور اس میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکی ہوں۔ چند دن کی دیر اور ہے۔

نذر سجاد کا جواب میں نے دے دیا۔

"قمر زمانی"

قمر زمانی کے اس خط میں اور اس سے پہلے دگیر کے خطوں میں نذر سجاد کے جس خط کا ذکر بار بار آیا ہے۔ وہ بھی قمر زمانی اور دگیر کے خطوں کے مسودات میں محفوظ ہے۔ یہ خط اردو کے ممتاز انشا پرداز اور افسانہ نگار سجاد حیدر یلدرم کی بیگم کا خط ہے۔ نذر سجاد خود بھی اردو کی مشہور ادیبہ تھیں افسوس کہ اب وہ بھی مرحومہ ہو چکیں۔ نذر سجاد کا خط دیکھئے۔ یہ نقاد کی جوائنٹ ایڈیٹر قمر زمانی کے نام ہے۔

(د) جاپلنگ روڈ لکھنؤ

۲۲ر اپریل ۱۷ء

پیاری جائنٹ ایڈیٹر صاحبہ نقاد

اب تک تو نقاد کے ناپید ہو جانے کا بے حد افسوس تھا لیکن آج دو سال بعد قمر زمانی مسیحی کے ہاتھوں دوبارہ زندگی پاتے ہوئے دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ نہ صرف اس امر کی کہ پیارا نقاد زندہ ہو گیا بلکہ اس کی کہ اب کے وہ ایک روح پرور جان بخش چھوٹے چھوٹے نازک ہاتھوں میں پیدا ہوا اور پرورش پائے گا۔ اسی نقاد نے ہم سے آپ کا تعارف کر دیا ورنہ اب تک "قمر" بے مثال کی روشنی سے دنیا محروم تھی۔

خود ہمیں ہی معلوم نہ تھا کہ ہمارے فرقے میں بھی ایک چمکتا ہوا تارہ پوشیدہ ہے جس کی شعاعیں نقاد کے ذریعہ اب عالم کو منور کریں گی۔

لیکن بھئی میں تو آپ کے گول مول تعارف سے کچھ مطمئن نہیں ہوں۔ دیکھئے اب بھلا مجھ سے کیا پردہ۔ گو آپ سے نہیں لیکن ہم میاں بیوی کے شاہ دگیر صاحب سے پرانے مراسم ہیں۔ بس آیئے اور زیادہ نہیں تو مرے برقعہ میں میرے نقاب ہی کے اندر قمر کا چہرہ کر دیکھئے تاکہ اور کوئی نہ دیکھے اور میں دیکھ لوں اچھی طرح پہچان لوں اور رونمائی میں جو کچھ آپ طلب کریں نقاد کے لئے دے دوں۔ کہو منظور ہے۔ بھئی ہم سے پوشیدہ نہ رہو۔ بے نقاب ہو کر میرے نقاب میں آؤ سہ

ہم سے پردہ نہ کرو قمرِ درخشاں ہو کر
آؤ مل جاؤ گلے اب تو مہرباں ہو کر

کیا یہ مناسب ہے کہ ایڈیٹر نقاد یہ حد درجہ مہربانی کہ انہیں دنیا سے بے نیاز کر دیا اور ہم سے یہ بے پرواہی، کج ادائی و بے مروتی کہ قمر ہو کر بدلی کی آڑ چاہتی ہو۔ تمہیں نہیں یہ نہ ہوگا۔ اس کے جواب میں مفصل حالات کا خط لکھیں کہ آپ آگرہ میں کب سے قیام پذیر ہیں اور اس سے قبل کسی اور زنانہ اخبار وغیرہ میں بھی اس نام سے کچھ لکھتی رہی ہیں یا نہیں۔

یہ نام تو پہلے بھی نظر سے گزرا ہے لیکن معلوم نہیں کہ وہ آپ ہی تھیں یا کوئی اور۔

امید ہے کہ اس کا جواب شاہ دستگیر صاحب شافی لکھوائیں گے تاکہ پھر مجھے کسی اور سوال کی ضرورت نہ رہے۔ میں آج کل بیمار ہوں۔ آپ کا نقاد خود پڑھ بھی نہ سکی۔ سجاد صاحب سے پڑھوا کر سنا اور اب لیٹے لیٹے اپنی بہن سے خط لکھوا کر بھیجتی ہوں۔ جواب ذرا جلدی دینا والسلام

خاکسار

نذر سجاد حیدر

قمر زمانی نے نذر سجاد کے مندرجہ بالا خط کا درج ذیل جواب دیا۔ یہ خط بھی مسودے میں محفوظ ہے۔

معرفت پوسٹ ماسٹر دہلی

مکان حافظ عزیز الدین نقشبندی

۹ رمئی ۱۷ء

میری پیاری بہن! میں ان پرسش کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں۔ معافی چاہتی ہوں کہ جواب اس قدر تاخیر سے جا رہا ہے۔ میں اس زمانے میں بعض خانگی معاملات کی وجہ سے سخت پریشان رہی اور اب بھی ہوں۔

جو کچھ نقاد میں ظاہر کیا گیا ہے وہ درست ہے۔ اس سے قبل آپ نے اگر میرا نام کہیں دیکھا ہے تو وہ میرا نہ ہوگا۔ میرے لئے تو یہ پہلی فرصت اور پہلا موقع ہے کہ پبلک میں اس طرح آئی ہوں۔ کامل دس سال ادب کا مطالعہ کیا اور اب لکھنے لگی۔ کیا برا کیا۔

آپ کو میں جانتی ہوں۔ مگر آپ مجھے نہیں جانتیں اور نہ جاننے کی کوئی وجہ۔

میں اپنے متعلق اس سے زیادہ کیا لکھوں کہ ایک مصیبت زدہ عورت ہوں اور سخت تباہ۔ خدا آپ کو خوش رکھے کہ دل پرسی فرمائی۔

میں نہ کبھی آگرہ گئی اور نہ اس وقت ہوں میرا پتہ عنوان پر درج ہے اس سے مجھے خطوط ملتے رہتے ہیں۔

بدنصیب

"قمر"

قمر زمانی نے اپنا خط ۱۱ر مئی کو پوسٹ کیا تھا۔ ۱۲ر کو دلگیر کو مل گیا۔ اسی دن انہوں نے اس خط کا جواب لکھا اور اطمینان کا سانس لیا۔ دلگیر کا خط دیکھئے:۔

۱۲ر مئی ۱۷ء

پیاری قمر

ابھی ابھی مسیحا نامہ ملا۔ ع "مر رہا تھا جلا دیا تم نے"

کل مایوس ہو کر ایک اور خط بریلی بھیجا تھا۔ خدا جانے اب اس کا حشر کیا ہو گا۔ اس خط سے قبل ۹ر مئی کو گیتان جلی بذریعہ رجسٹری (بریلی) روانہ کر چکا ہوں کا ہے کو ملی ہوگی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ بریلی سے گیتان جلی اور میرا ۱۱ر مئی کا خط منگالیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو مجھے افسوس ہوگا۔ افسوس ہے کہ آپ ادھر مطمئن نہ رہ سکیں۔ خدا اب اطمینان دے۔

دلی کا نام نہ لیجئے۔ یہ نام سن کر خدا جانے میں کیوں کانپ جاتا ہوں لے آپ کی بیگانگی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ نقاد کا کس کافر کو ہوش رہا۔ اب آپ کا خط آیا ہے تو نقاد کا کام بھی ہو گا۔ پرچہ لکھا ہوا کب کا تیار رکھا تھا اور آپ کا خط اس سے قبل مل جاتا تو اب تک چھپ کر آپ کے ہاتھ میں ہوتا۔ اس قدر پریشانی تھا کہ نقاد چھپوانے کو جی نہ چاہا۔ آج چھپنا شروع ہوگا اور انشاء اللہ تعالیٰ ایک ہفتے کے اندر اندر تیار ہو جائے گا۔

اس تعویق کا ذمہ دار کون ہے۔ یقیناً میں نہیں۔

"حسن" کو بہت جلد پورا کر کے بھیج دیجئے کہ تیسرے نمبر کی کتابت اس کے انتظار کی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔ میں "حسن" کو اس نمبر کا عنوان اولین بنانا چاہتا ہوں۔ اپنی محبت کا واسطہ جلد بھیج دیجئے کہ اس کے لئے "نقاد" کے کتنے صفحے محفوظ رکھے

لے: دلی میں قمر زمانی سے پہلی ملاقات کی طرف اشارہ ہے۔

جائیں کہ اس کے آگے کتابت شروع کرادوں۔

میں اور آپ سے خفا تمام دنیا ملنے پر بھی ممکن نہیں ـــــ

آہ! آخر مئی سے اب جون[۱] ہو گیا۔ یوں ہی آج کل میں قیامت نہ آجائے "ہم ایک جگہ بیٹھ کر باتیں کریں گے"۔ کیا سچ۔

ع کھاؤ تو قسم میرے لہو کی

آہ خدا جانے کیوں باور نہیں آتا۔ خیر زندگی ہے تو یہ چند دن بھی گزر جائیں گے خدا اس خواب کی تعبیر پوری کرے۔ کہو آمین۔

ہائے اللہ یہ انیس دن کیسے کٹیں گے۔

مختلف اخبارات اور رسائل نقاد پر ریویو کر رہے ہیں۔ اس وقت تک سب سے اچھا ریویو "گلچین" نے کیا ہے (جو آج آپ کے خط کے ساتھ ہی مجھے ملا) اور جسے حضرت ریاض[۲] نکالتے ہیں) جسے میں نقاد میں نقل کر رہا ہوں۔

گلچین نے آپ کی "جاندار بتی"[۳] بھی اپنے دامن میں لے لی ہے۔ یعنی ریویو کے ساتھ نقل کی ہے۔ اس کے بعد خطیب[۴] دہلی کا دلکش ریویو ہے۔

"ستارۂ صبح" نے اپنی تازہ اشاعت میں نقاد پر تفصیل سے نگاہ ڈالی ہے اور آپ پر بھی نظر استفادہ ہے جس کا جواب آپ کو نقاد کے ذریعہ دینا چاہیئے اور جلد ارشاد ہو تو "ستارۂ صبح" بھیج دوں۔ یہ بھی لکھئے گا کہ بذریعہ رجسٹری روانہ کروں یا معمولی طور پر۔

"الناظر[۵]" نے آپ پر اور نقاد پر نہایت ناپاک نگاہ ڈالی ہے۔ مئی کے پرچے میں خوب زہر اگلا ہے۔ بے نقط گالیاں دی ہیں۔

---

۱ : قمر زمانی نے پہلے مئی میں ملنے کا وعدہ کیا تھا پھر جون پر ٹال دیا۔

۲ : ریاض خیرآبادی۔

۳ : قمر زمانی کا مختصر سا مضمون جو اس سے پہلے کسی خط کے ساتھ نقل کیا جا چکا ہے۔ یہ اپریل ۱۷ء کے نقاد میں چھپا تھا۔

۴ : ہفتہ وار "خطیب" دہلی سے ملا واحدی صاحب کی ادارت میں نکلتا تھا۔ نیاز فتح پوری اس کے قلمی معاونین تھے۔

۵ : الناظر لکھنؤ سے ظفر الملک نکالتے تھے۔ نقاد اور نقاد کے قلمی معاونین سے اس کی خوب چلتی تھی۔

جن کا میری رائے میں سوائے اس کے کچھ جواب نہیں ہو سکتا۔

"مہ نور مے فشاند و سگ بانگ می زند"

آپ کو دیکھنا بھی نہ چاہیے۔ اس لئے اسے بھیجنے کا خیال بھی نہیں۔ ہاں آپ کے دلی گزٹ دہلی نے بھی بہت کمینہ حملہ مجھ پر اور آپ پر کیا ہے۔ جواب کی حد تک جواب بھیجا تھا مگر میں نے ان بھونکنے والوں کی کچھ پروا نہیں کی۔ آپ قطعاً نظر انداز کر دیجئے ع

ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

اور اخبارات نے جو ریویو کئے ہیں وہ قابل ذکر نہیں۔ سب نے معمولی تعریف کی ہے۔ عام طور پر آپ کی نسائیت میں شک کیا جاتا ہے اور لوگ باور نہیں کرتے کہ یہ مضامین ایک عورت لکھ سکتی ہے۔ اس لئے اکثر پڑھے لکھے لوگ آپ کا پتہ، نشان اور صحیح نام دریافت کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ زیادہ تر یہی خیالات آپ کی نسبت "ستارۂ صبح" نے بھی ظاہر کئے ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ان تمام تشکیک شبہات کا تسکین بخش جواب آپ کی طرف سے نقاد میں جلد شائع ہو جائے۔ ورنہ آپ جانتی ہیں تمام دنیا دستگیر نہیں اور میں بدگمان طبیعتوں کو کس طرح یقین دلاؤں کہ آپ مرد نہیں عورت ہیں اور عورت بھی کیسی...

تجھ کو مجھ سے چھین لینے والی

حامد حسن قادری[1] نے نقاد میں آپ پر بہت پاکیزہ نگاہ ڈالی ہے جسے پڑھ کر میں خوش ہوں اور نقاد میں شائع کرنے پر مجبور ہوں۔ آپ بھی اسے جلد دیکھ سکیں گی۔ انہوں نے بھی آپ کی نسائیت میں شک کیا ہے اور عورت سے یہ خیالات منسوب کرنے میں وہ متامل ہیں لیکن نہایت شریفانہ اور مہذب پیرایہ اختیار کیا ہے جس سے آپ کی تنقیص نہیں توصیف نکلتی ہے۔

بہر حال میری رائے ہے کہ "ستارۂ صبح" اور قادری کی رائے دیکھ کر آپ کو ایک مضمون لکھ دینا چاہیے جس سے لوگوں کو اطمینان ہو جائے اور یہ بحث ہمیشہ کیلئے ختم۔

ہائے آپ کو خط لکھتا ہوں تو ختم کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ باتیں نکلتی ہی آتی ہیں۔

---

[1] : مولانا حامد حسن قادری مولف داستان تاریخ اردو۔

اک آپ ہیں کہ چند سطروں سے زیادہ کبھی مجھے نہیں لکھتیں۔ وہ بھی مدت بعد۔ اچھا یہ صحبت ختم پھر ملیں گے۔

خدا کرے یہ خط آپ کو مل جائے اور جواب حسب وعدہ جلد آئے کہ مجھے اظہار آرزو پر مجبور ہونا پڑے۔

سراپا شوق

"دلگیر"

دلگیر نے اپنے اس طویل خط میں دو تین باتوں یعنی ایک اپنے اضطراب۔ دوسرے قمر زمانی سے ملنے کی تدبیر۔ تیسرے قمر زمانی کی طرف سے لوگوں کے شکوک کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ قمر زمانی نے دلگیر کے خط مرقومہ ۱۲ ارمئی کے جواب میں مختصراً لکھا۔

۲۰ ارمئی ۱۷ء

میں اور آپ سے خفا ہو جاؤں۔ یہ کیا کہا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ میری مجبوریاں آپ کو میرے خلوص کی طرف سے اکثر بدگمان کر دیتی ہیں۔ اس سے پہلے ہی لکھ چکی ہوں کہ کن پریشانیوں میں گھری رہی اور غالباً آپ نے یقین بھی کر لیا ہوگا میں ابھی تک یہیں ہوں۔ آپ اطمینان فرمائیں۔ میں فکر سے خالی نہیں ہوں۔ دیر ہو جانے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر تاخیر کا انجام کامیابی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ نامراد نہ رہوں گی۔ بعض صورتیں ایسی پیدا ہو گئیں ہیں کہ رمضان (ماہ جون) سے پہلے شاید ممکن نہ ہو۔ لیکن یہ مسرت کیا کم ہے کہ یہ زمانہ............ حال سے مجبور رہے گا کہ اب کے عید کسی کی محبت میں ہوگی۔ شوال کا پہلا ہفتہ ابھی سے نوٹ کر لیں۔

مضمون بھی جلد روانہ کرتی ہوں۔

کیا میری خط و کتابت کا علم مسز دلگیر کو ہے۔ اگر ہے تو ان کا کیا خیال ہے اور اگر آپ نے اس وقت تک ذکر نہیں کیا تو آخر سوچا کیا ہے اور کب تک وہ آگاہ نہ ہوں گی۔ کیا میں آپ کی فیملی کے حالات پوچھ سکتی ہوں کہ عزیزوں کو جواب دے سکوں۔ اگر ضرور مجبور کرے۔

بیتاب

"قمر"

اس خط کے ساتھ ہی قمر زمانی نے اپنی نسبت، وہ مضمون بھی لکھ بھیجا جس کی فرمائش

شاہ دلگیر نے نقاد کے ان قارئین کو مطمئن کرنے کے لئے کی تھی جو قمر زمانی کے عورت ہونے میں شبہ کر رہے تھے۔ قمر زمانی کا یہ مضمون نقاد بابت جولن ۱۹۱۷ء کے ابتدائی صفحوں میں شائع ہوا ہے۔ اس پر بھی نگاہ ڈالتے چلیئے:۔

کچھ اپنی نسبت

مجھے کوئی خلش تو نہ تھی لیکن ہاں کچھ ضرور تھا کہ میں نقاد میں مضمون تو لکھتی ہوں مگر دیکھئے لوگ کیا کہتے ہیں۔ ہر چند مجھے تفصیل تو نہیں معلوم کہ کس نے کیا کہا اور اس کی تو خبر ہی نہیں ہو سکتی کہ کس نے کیا خیال کیا۔ تاہم کچھ مجھے معلوم ہو سکا ہے وہ عین توقع کے موافق ہے اور مجھے ذرا بھی حیرت نہیں۔

سب سے پہلا خیال جو پبلک علی الخصوص مردوں کو ہو سکتا تھا وہ یہی ہے کہ میں عورت نہیں ہوں۔ کیونکہ کسی عورت کا ایسے مضامین لکھنا بالکل نئی بات ہے اور کسی طرح ذہن میں نہیں آتی۔ اس میں کلام نہیں کہ یہ خیال مردوں کو قائم کرنا چاہیئے اور قدرتاً ان کو فوراً یقین کر لینے سے گریز ہونا چاہیئے۔ لیکن کیا میں یہ سوال کرنے کی جرأت کر سکتی ہوں کہ عورت اگر ایسے مضامین نہیں لکھ سکتی تو کیا مرد عام طور سے لکھ سکتے ہیں۔ پھر جب مردوں میں صرف دو چار ایسے نکل سکتے ہیں تو اگر عورتوں میں اس وقت تک صرف ایک فرد ایسا نظر آئے تو کیا گناہ ہے۔ پھر محض قیاس پر اعتبار کر کے حقیقت سے انکار کر دینا یہ کیسا فلسفہ ہے۔ موجودہ فلسفہ استقرا محض ہے اور کچھ نہیں تو کیا کوئی مرد اس کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کو سارے جہان کی عورتوں اور ان کے مبلغ علم کا حال معلوم ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ان کا یہ یقین کر لینا کہ میں عورت نہیں ہوں، صرف اس دلیل کی بنیاد پر کہ آج تک کوئی عورت ایسا لکھنے والی ان کو نظر نہیں آئی کیسا غلط استدلال ہے۔

میں پہلے ہی جانتی تھی اور میں نے ظاہر بھی کر دیا تھا کہ "مردوں کو اپنی ان ذمہ داریوں کا احساس نہیں ہے، جن کا احساس ہی تفریق زن و مرد کے احترام کو قائم رکھ سکتا ہے۔" اور آخر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ بہر حال مجھے ان حضرات سے کوئی شکوہ نہیں جنہوں نے مجھے اپنی جنس میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ میں کیا کرتی اگر وہ یہ کہہ دیتے کہ قمر زمانی نہ مرد ہے نہ عورت بلکہ

کسی تیسری جنس میں سے ہے اور نہ مجھے ان رسائل سے کوئی ملال جنہوں نے اپنے پندار میں میری سخت توہین کی ہے۔ کیونکہ وہ اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے تھے اور اپنی کمزوریوں کی پردہ پوشی کا طریقہ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن اگر مجھے خیال ہے تو صرف ان چند حضرات کا جن کی نسبت بخدا مجھے کبھی خیال بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ ایسا سمجھیں گے اور اگر سمجھیں گے تو اس کا اظہار کریں گے سو اس میں سارا قصور میرا ہے کہ میں نے کیوں کسی کی نسبت کوئی غلط خیال قائم کر لیا تھا اور غالباً میرے لئے یہی سزا کافی ہے۔

میرے پاس لکھنؤ سے ایک خاتون کا خط آیا تھا جس میں انہوں نے نہایت شوخ انداز سے میرے حالات دریافت کئے تھے۔ اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ واقعی وہ تحریر انہیں خاتون کی ہے جن کا نام ظاہر کیا گیا ہے تو میں ایسا خشک جواب نہ دیتی لیکن چونکہ مجھے علم تھا کہ خاتون کے پردہ میں خود ان کے میاں[1] ہیں۔ اس لئے میں نے خود اعتنا نہیں کیا اور غالباً ان حضرات کے لئے یہ کافی تنبیہہ ہو گی۔ مدعا یہ ہے کہ جو حضرات مجھے عورت نہیں سمجھتے وہ بجا توہین کرتے ہیں اور جو جانتے ہیں وہ ایسی نازیبا حرکتیں کرتے ہیں۔ لیکن آپ لوگ یہ یقین کر لیں کہ ایک دن وہ آنے والا ہے جب میں زبردستی بچہ بچہ سے تسلیم کرا لوں کہ ادب لطیف کا بہترین نمونہ اگر کوئی پیش کر سکتا ہے تو وہ صرف عورت کا دماغ ہے اور اگر اخلاق کے لحاظ سے اب بھی کوئی فرد دکھایا جا سکتا ہے تو وہ آپ کو جنس ضعیف ہی میں ملے گا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگوں میں یہ خلش کیوں پیدا ہوئی اگر آپ نے مجھے مرد ہی سمجھا تو بھی کیا، آپ نفس مضامین کو دیکھئے اس سے کیا بحث کہ ان کا لکھنے والا کون ہے اور اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ مجھے عورت یقین کر لینے کے بعد آپ میرا امتحان لیں تو آپ کو ابھی سے باور کر لینا چاہیئے کہ میں حریف آزمائش نہیں ہوں۔ اگر میں زندہ رہی جس کی امید کم ہے تو آپ کو خود اس کا یقین ہو جائے گا اور اگر آپ نے اس وقت کسر نفس کو دخل دیا اور خود اپنے تئیں اس قابل نہ سمجھا کہ ایک ناتواں ہستی کے مقابلہ میں آئیں تو میں قصوروار نہ ہوں گی

---

[1]: "خاتون" سے مراد نذر سجاد اور "میاں" سے مراد نذر کے شوہر سجاد حیدر یلدرم ہیں۔

گی نقاد چونکہ صرف ادبی رسالہ ہے۔ اس لئے میں مجبور ہوں کہ غیر متین و سنجیدہ لٹریچر سے بحث نہیں کر سکتی ورنہ میں بتاتی کہ مذہب و سیاست کو ایک نسوانی دماغ بھی اسی قدر سمجھ سکتا ہے جتنا ایک مرد کا مغرور دماغ۔

اس امر کے متعلق یہ میری آخری تحریر ہے اور اب میں مطلق اعتنا نہیں کروں گی کہ کوئی کیا سمجھتا ہے۔ اب آپ کو اختیار ہے خواہ اپنا وقت مجھ کو رانکیتے میں ضائع کیجیے یا کسی ایسی چیز کے حاصل کرنے میں جس سے آپ بے بہرہ ہیں اور جس کے نہ ہونے سے آپ کو بیکار آتش حسد مشتعل کرنی پڑتی ہے۔ کیا اچھا ہو اگر آپ میرے مضامین کے سمجھنے کی کوشش کریں اور اس بحث کو چھوڑ دیں کہ میں کون ہوں۔ جو کچھ میں ہوں میں وہی رہوں گی۔ آپ کی حجت سے نہیں بدلنے سے رہی پھر کیوں آپ اپنا اور میرا وقت ضائع کرتے ہیں آپ اس قابل نہ سہی لیکن آپ کے طبقہ میں دو چار قابل نکلیں گے ان کی عزت تو نہ برباد کیجیے۔

"قمر"

قمر زمانی کا یہ مضمون ان کے خط مرقومہ ۲۰ مئی کے ساتھ ساتھ گیا تھا۔ قمر زمانی نے اپنے خط میں دلگیر کے فیملی کے حالات پوچھے تھے اور مئی کے آخری ہفتے میں ملاقات کے وعدے کو شوال کے پہلے ہفتے یعنی ماہ جون پر ٹالدیا تھا۔ اس مکتوب نے شاہ دلگیر کو ایک طرح کی تشفی بخشی لیکن مایوس بھی کیا۔ چنانچہ انہوں نے قمر زمانی کے خط کے جواب میں اب کے قدرے مختصر خط اس طرح کا لکھا۔

۲۳ مئی۔

خدا کا شکر ہے کہ خط تو ملا۔ یہاں اس کی بھی امید نہ رہی تھی۔ آپ نامراد نہ رہیں مگر میں تو یقیناً نامراد ہوں اور نامراد رہوں گا۔ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ خیر اللہ کی مرضی۔

آخری مئی لوٹ گئی تھی اس کا کیا نتیجہ نکلا شوال کا پہلا ہفتہ بھی اک خواب ہے وہ بھی پریشان۔ میں اب بالکل مایوس ہوں اور کوئی امید نہیں رکھتا

سب حسرتوں کا یاس نے کھٹکا مٹا دیا
جن سے خلش تھی دل میں وہ کانٹے نکل دیا

مجھ گمنام خلائق اور رسوائے زمانہ کے حالات ہی کیا کہ آپ پوچھیں۔ آہ ع

میں رسوائے جہانِ آرزو ہوں یعنی حسرت ہوں

اور سوالات کا جواب زبانی دے سکتا ہوں لیکن اس زندگی میں آپ سے ملنے کی کوئی توقع اب مجھے نہیں کہ عنقارا بلنداست آشیانہ۔" ایاز۔ قدرِ خود بشناس" کے مقولہ پر نظر ہوتی تو آج یہ صدمہ مجھے نہ ہوتا۔

اللہ رے آپ کی محبت کے طلسم جمیل کی سحر کاریاں

لیکن میں اس نامرادی میں خوش ہوں خدا آپ کو خوش رکھے۔

"دلگیر"

قمر زمانی نے جب یہ دیکھا کہ شاہ دلگیر کی مایوسی حد سے بڑھتی جارہی ہے تو انہوں نے ان کو سنبھالنا چاہا اور ان کے خط کے جواب میں بلا تاخیر لکھا۔

دہلی ۳۰ رمئی ۱۹۱۷ء

دلگیر صاحب

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ کو کیا خیال کروں۔ کبھی تو آپ کی طرف سے میری توقعات اس قدر بلند قائم ہو جاتی ہیں کہ مجھے اپنی قسمت پر خود رشک آنے لگتا ہے اور کبھی آپ ایسا رنگ بدلتے ہیں کہ اپنی جان سے بیزار ہو جاتے ہیں۔

خدا کے لئے تباہ نہ کیجئے اور مجھے دنیا میں کچھ کرنے دیجئے اس سے زیادہ کیا کہوں۔ آپ کے ۲۳ رمئی کے خط نے تو مجھے بالکل بیکار کر دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں کر آپ کو سمجھاؤں۔ بہتر ہے آپ خط میں نہیں لکھتے نہ لکھیئے مگر زبانی تو کہیئے گا یا یہ بھی نہیں۔

خدا کے لئے اس کے جواب میں مجھے اطمینان دلایئے کہ آپ مایوس نہیں ہیں

آپ کی

"قمر"

اس سے پہلے کے خطوں میں قمر زمانی نے شاہ دلگیر کو "جانِ قمر" "قمر نواز" اور "پیارے دلگیر" وغیرہ کے القاب سے مخاطب کیا تھا۔ اس دفعہ صرف "دلگیر صاحب" لکھا اور خود کو ان سے بھی زیادہ مضطرب و بے چین کیا۔ دلگیر کو قمر زمانی کے اس خط سے تازہ زندگی مل گئی۔ یاس، امید میں بدل گئی چنانچہ انہوں نے اس خط کے جواب میں ایک طویل خط لکھا۔

۷؍جون ۱۸ء

سمجھا دے تو ہی کچھ تو انہیں اے نگاہِ یاس
اب کوسنے کا وقت نہیں ہے دعا کریں

میری جان!

ترسنے والی آنکھوں کا شکریہ تم قبول ہو کہ ۳۰؍مئی کا لکھا ہوا خط ۲؍جون کو ملا۔ پیارے دگیر صاحب ہوا۔ کیوں نہ آپ کی خفگی کا احساس کروں۔ ہائے کیونکر عرض کروں کہ اس خطاب سے مجھے کتنا صدمہ پہنچا۔

آپ تو مجھے بدنصیب دگیر لکھا کیجئے۔ میری روح خوش ہوگی۔ دعائیں دوں گا آپ مجھے پاگل سمجھئے سچ کہتا ہوں ۳۱؍مئی کے بعد سے اپنے ہوش میں نہیں ہوں۔ خدا جانے مجھے کس نے کیا کہہ دیا ہے۔ اگر بہکی بہکی باتیں کرتا ہوں، لوگ دیوانہ سمجھتے ہیں اور حق بجانب ان کے ہے۔ اپنے ہی شعر کا مصداق ہو رہا ہوں ؎

ہر بات پہ رونا ہے ہر بات پہ کڑھنا ہے
یہ دل بھی عجب جی ہے یہ جی بھی عجب جی ہے

سنو پیاری، تم سنو۔ جوشِ دیوانگی میں وہ بات کہے دیتا ہوں جو شاید کسی اور حالت میں نہ کہہ سکتا۔ بات یہ ہے کہ آپ کو اس درجہ مہربان اور اس درجہ شفیق و غمگسار و دگیر دیکھ کر مجھے کسی طرح یقین نہیں آتا کہ یہ خواب نہیں واقعہ ہے۔ میں کم بخت ازلی نامراد ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہمیشہ دگیر رہنے کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ اس لئے اُمید بھی میرا دل توڑ دیتی ہے۔ ہائے خود ہی کہا ہے اور بالکل سچ کہا ہے۔

ٹوٹ جاتا ہے یہ اُمید سے آہ
نامرادوں کا جی بھی کیا جی ہے

خدا نہ کرے کہ کسی سے امید قائم ہو اور پھر ٹوٹ جائے۔ آہ آپ کی محبت کو دیکھ کر اُمید پیدا ہوئی اور اس کے پیدا ہونے سے ہی سمجھتا ہوں کہ نامراد رہوں گا۔ نامرادی قسمت میں نہ ہوتی تو یہ امید بھی پیدا نہ ہوتی ہائے اپنے گذشتہ تجربے سے ڈرتا ہوں اور اپنی قسمت سے خائف ہوں اور اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ اب سے یہ آرزو جان لینے کے لئے پیدا ہوئی ہے اور میں جان دوں گا ؎

میں بھی جان دینے کو تیار ہوں دل کہتا ہے
جان لیتا ہے اگر عشق طرحداروں کا

ہائے آپ بھی کہتی ہوں گی کہ کس دیوانے سے پالا پڑا ہے لیکن یاد رکھیے۔

ایسے دیوانے ریاض اور کہاں نازک طبع
وہ اگر بھول سے بھی ماریں تو فریاد کریں

سچ یہ ہے کہ آپ کی عدیم النظیر قابلیت و فقید المثال محبت اور میری مسلسل بے کمالی و بدقسمتی ہی نے مجھے اس بات کا اب کامل یقین دلایا ہے کہ آپ کے قدموں تک واقف رسائی پانا محال ہی نہیں جنون ہے اور اس یقین کے بعد صرف ایک ارادہ میں نے کر لیا ہے جو وقت پر پورا ہوگا۔ کبھی سن لینا۔

ہائے اس وقت کے تصور سے میری روح کس قدر مسرور ہے۔ آپ بھی دعا کریں خدا وہ وقت جلد لائے اور میری مشکل آسان ہو۔ میں خود تباہ ہوں۔ کسی کو تباہ کیا کروں گا۔

جس کا دیوانہ ہوں جب تک وہ سمجھانے نہ آئے۔ میں کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ آہ! زبانی کہاں سنانے کی عزت حاصل ہوتی ہے۔ اس حسرت میں جان نکلے گی حتیٰ

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

ہائے اللہ کیونکر اطمینان دلاؤں کہ میں مایوس نہیں ہوں۔ یہ اطمینان تو آپ ہی کے ہاتھ ہے جس کی طرف سے خبر نہیں کیوں مجھے مایوسی ہے۔ اتنی تمنا تھی کہ قدموں میں گر کر جان نکلتی۔ لیکن آہ یہ تمنا بھی دل ہی میں رہتی معلوم ہوتی ہے۔ اچھا نہ نکلے۔ جان تو نکلے گی یا یہ بھی نہیں۔

"حسن" اب تک نہ آیا۔ تیسرا نمبر بغیر آپ کے "حسن" کے معرا رہے گا۔ خیر آپ کی مرضی مرنے والا اب کس منہ سے شکایت کرے۔ خدا حافظ۔

جانباز
"دلگیر"

دلگیر نے یہ خط ۲۸ جون کو ڈالا تھا۔ قمر زمانی کی طرف سے جواب میں دیر ہوئی تو ایک ہفتہ انتظار کر کے دوسرا خط لکھا۔

۱۱ جون

پیاری قمر

خدا کی قسم آپ کی محبت دیکھ لی یاں جان پر بنی ہوئی ہے اور آپ ہیں کہ جواب تک نہیں دیتیں ؎

ظالم یہ محبت کا تو دستور نہیں ہے

میں اب بھی شکایت نہ کرتا اگر آپ وعدہ نہ کرتیں کہ جلد جواب دیتی رہوں گی۔ اُو۔ تلق اس کا ہے سے

ہنسے گی دنیا یہ دیکھ کر کہ ظالم کیا طریقہ ہے
کہ سچے چاہنے والوں کو جھوٹا آسرا دینا

ماہ مئی گزر گیا۔ جون بھی گزرا جا رہا ہے۔ ہائے پھر کونسا وقت آئے گا۔ "ایک جگہ بیٹھ کر باتیں کریں گے"۔

"شوال کے پہلے ہفتے میں" آہ! اس وقت تک کون زندہ رہے گا۔ سنتا ہوں رمضان المبارک میں مرنے والوں کو شہادت کا درجہ ملتا ہے۔

اچھا رمضان شریف کی ۲۶ تاریخ ابھی سے نوٹ کر لیجئے۔ دیکھنا ہے کون سچا نکلتا ہے۔

مجھ سے آپ خفا نہیں لیکن غریب "نقاد" سے خفگی کا سبب تو بتلائیے کیا ہے۔ دوسرے نمبر کی رسید تک نہیں۔ اس پہ اظہار رائے کی ؟

"حسن" اب تک عنایت ہوتا ہے، غزل اب تک ملتی ہے اور مضامین کا کیا ذکر۔ آپ کی قسم تیسرے نمبر کی اشاعت محض آپ کے موعودہ مضمون کے انتظار کی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔ ورنہ اب تک وہ شائع ہو جاتا۔ تیسرا نمبر آپ سے خالی رہا تو کیا ہوگا۔ آپ کو اتنا بھی خیال نہیں۔ اسی سے میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ مجھ بدنصیب کے ساتھ آپ "نقاد" سے بھی خفا ہیں جو اب میرا نہیں صرف آپ کا ہے۔

خدا کے لئے "حسن" یا اور کوئی مضمون جلد بہت جلد بھیج دیجئے۔ ورنہ تمہاری جان کی قسم زہر کھا لوں گا پھر نہ رونا۔

"دلگیر"

۱۱ رجون کو دلگیر نے یہ خط ڈالا۔ ادھر سے ۱۳ رجون کو قمر زمانی نے ان کے خط مرقومہ ۴ رجون کا جواب لکھا۔

۱۳ر جون ۶۷ء

پیارے دگیر

لیجئے اب تو خوش ہوں "صاحب" کہنے کا اتنا رنج ہے

بت کہہ دیا منہ سے وہ اب بولتے نہیں

اتنی سی بات کا انہیں اتنا ملال ہے

کیا آپ میرے "صاحب" نہیں۔ میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ آپ کی تکلیف ملال اور رنج نومیدی سے میرے اوپر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ میں تو کہتے کہتے تھک گئی ہوں۔ آپ نے میری باتوں کا جواب ٹال دیا۔ خیر یہ جان گئی جو بات ہے لیکن صدمہ اس بات کا ہے کہ آپ کے انداز تحریر سے کچھ بے اعتباری سی پیدا تھی۔ جس کو میں اس وقت تک ٹالنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ خیر اگر آپ کی بدظنی اور مایوسی آپ کے قابو نہیں تو خدا کی مرضی میں کیا کر سکتی ہوں۔ افسوس ہے آپ کی محبت محتاط کی ہوشیاریاں میری سمجھ سے اس طرح باہر ہیں جس طرح ایک عورت کی شیفتگی معصوم۔ مرد ہوشیار کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتی۔

یہ آپ یقین رکھیے مجھ سے کبھی وہ بات نہیں ہو سکتی جو خود میرے نزدیک بُری ہے۔ آپ کی مایوسیوں کا علاج میرے پاس سوائے اس کے اور کوئی نہیں تھا جو ظاہر کر چکی ہوں اگر آپ کو وہ منظور نہیں تو جانے دیجئے جب آپ ان معمولی باتوں کا جواب دینے سے گریز کرتے ہیں جو لازمی طور سے پوچھی جاتی ہیں تو پھر نتیجہ معلوم؟

جی ہاں "حسن" ہنوز ناکمل ہے اور شاید رہے گا۔ کیونکہ تکمیل "حسن" کے لئے التفات عشق ضروری ہے اور وہ مجھے حاصل نہیں۔

بدنصیب

"قمر"

شاہ دگیر نے قمر زمانی کا خط پاتے ہی اس کے جواب میں انہیں لکھا۔

۱۵ر جون ۶۷ء

جانِ دگیر

اللہ کا شکر ہے آپ کا خط ملا۔ دل کا بار ہلکا ہوا۔ خدا آپ کا "صاحب"

مجھے کرے ، پھر کوئی شکایت نہ ہوگی۔ میں آپ کی طرف سے بے اعتباری کر دیا قیامت تک ممکن نہیں۔ مجھ دوانے پاس ہوشیاری و احتیاط کہاں۔

دل دیا دل ہائے نامرادی مری

یہ صرف آپ کا خیال ہی خیال ہے۔ یہ آپ بھی یقین رکھیے کہ مجھ سے کبھی وہ بات نہیں ہو سکتی جو آپ کے نزدیک بُری ہو ؎

تم جس سے بدگمان ہو جس کا خیال تھا
وہ آرزو نہیں ہے دلِ بے قرار کی

استغفر اللہ میرے وہم و گمان میں بھی وہ بات نہ تھی جس کا آپ کو خیال ہوا۔

کدھر خیال گیا، کیا خیال کر بیٹھیں

ہائے آپ اب تک نہیں جانتیں کہ دلگیر آپ سے کیا چاہتا ہے۔ جن وجوہ سے میں مایوس ہوں ان کو میری بدقسمتی کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ سچ ہے خدا کی مرضی میں آپ کیا کر سکتی ہیں ؎

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم
ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کریں

کیسے ممکن ہے کہ وہ مجھے منظور نہ ہو جو آپ کو منظور ہے۔ اب تو جان بھی بغیر آپ کی مرضی کے نہیں دے سکتا۔

خدا جانے کیوں، اس وقت میں نے ٹال دیا تھا۔ لیکن اس سے مقصود آپ کو خفا کرنا نہ تھا۔ خیر اب آپ معمولی اور غیر معمولی باتیں شوق سے پوچھئے میں ہر ایک بات کا جواب دوں گا اور پھر میری تقدیر۔

نہیں یہ بات تو نہیں کہ التفاتِ عشق آپ کو حاصل نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں التفاتِ حسن کے قابل نہیں رہا۔

مایوسِ ازل
"دلگیر"

دلگیر کا یہ خط ابھی راستے ہی میں تھا کہ قمر زمانی نے ۱۷ جون کو ایک خط دہلی سے ڈالا۔ یہ دراصل دلگیر کے خط مرقومہ ۱۱ جون کا جواب ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اوپر کا خط قمر زمانی کو موصول ہو گیا ہو اور انہوں نے دانستہ اسے نظرانداز کر کے صرف ۱۱ جون کے خط کا جواب لکھنا پسند کیا ہو۔ بہر حال خط دیکھئے۔

۱۷ر جون ۵۲ء
ذریعہ یعقوب احمد صاحب
گلی اینٹا دہلی

پیارے دستگیر۔ آپ کی ۱۱ر جون کی تحریر پہنچی۔ کیا میرا خط آپ کو نہیں ملا۔ لکھنے کے بعد مل گیا ہوگا اور غالباً اب اس قدر برہم نہ ہوں گے۔ آپ کی فرمائش ایک تو پوری ہوئی دوسری باقی ہے وہ بھی کرتی ہوں۔ غالباً اس قدر لکھ دینا کافی ہوگا اور اب کوئی جھک مارے تو اپنا سر کھائے۔ یہ بھی میں نے آپ کی خاطر سے لکھ دیا۔ ورنہ واللہ میں تو اس طرف اپنی توجہ کرنا بھی توہین سمجھتی ہوں۔ اب کے پندرہ دوسرا ہے۔ آپ بھی کہتے ہوں گے یہ عجیب عورت ہے کہ روز فیا پتہ بتاتی ہے میں کیا کروں۔ دستگیر صاحب کچھ نہ پوچھئے میں کن مصائب میں گرفتار ہوں اور آپ ہیں کہ ذرا فکر نہیں کرتے۔ کچھ کہتی ہوں تو خفا ہو جاتے ہیں۔

یہ رمضان شریف کی ۲۰ر کیسی؟ یہ آخر آپ کو ہو کیا ہے۔ سنیئے شوال کے پہلے ہفتے میں آ جیئے اور ہمیشہ کے لئے میرے ہو جایئے۔ بولئے منظور ہے یا نہیں پوری کیفیت تو اس وقت عرض کروں گی جب آپ میری پہلی تحریروں کا پورا جواب دے دیں۔ نقاد کا دوسرا پرچہ خوب تھا اور آپ کا نوٹ میرے مضمون پر نہایت پاکیزہ تھا۔ اس میں آپ نے نہایت متانت سے اظہار کیا تھا اور یہی میں چاہتی ہوں۔ یاس تو نئی اچھا کہتے ہیں لیکن یہ غزل اس قابل نہ تھی۔ آپ اس قدر تعریف کرتے ہیں میں دیکھتی ہوں کہ بعض دفعہ نہایت غلو سے کام لیتے ہیں۔ یہ نامناسب ہے۔ تیسرے پرچے کا انتظار ہے۔ دیوان حسرت آج تک آرہا ہے کوئی اور چیز تنقید کے لئے روانہ کیجئے۔

"قمر"

یہ ۱۷ر جون کا خط ہے۔ اس خط نے پھر امید کی ایک لہر دوڑا دی۔ دستگیر نے خط پاتے ہی اس کے جواب میں تفصیلی خط اس طور پر لکھا۔

۲۲ر جون ۵۲ء
پیاری قمر
خوش رہو۔ ۱۷ر جون کا خط پڑھ کر جی خوش ہو گیا۔ خدا تمہیں با جی جمع محبت

سلامت رکھے کہ مجھ مردہ دل کی تنہا آرزو اب تمہیں ہو۔

۱۱ر جون کا خط مل گیا جس کا جواب اسی روز آپ کو لکھ چکا ہوں کیا وہ آپ کو نہیں ملا۔ غالباً لکھنے کے بعد مل گیا ہوگا۔ جو کچھ آپ نے اپنی نسبت لکھا اس کی ضرورت تھی۔ خوش ہوں کہ آپ نے میری خاطر لکھا اور جیسا میں چاہتا تھا ویسا ہی لکھا ہے۔

"حسن" کے لئے اب زیادہ منتظر نہ رکھئے جلد بھیج دیجئے کہ چوتھے نمبر کا عنوان بنا سکوں۔ جواب کے ساتھ ہی مل گیا تو میری شکر گزاری کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔ میں فکر نہیں کرتا اچھا حکم دیجئے میں بہت خوشی سے حاضر ہوں گا اور ہمیشہ کے لئے آپ کا بن سکا تو اس دستگیری کی ہستی پہ ناز کروں گا۔

پہلی تحریر کا جواب دے چکا ہوں اور اب آپ جو کچھ دریافت فرمانا چاہیں شوق سے پوچھیے۔ ہر ایک کا جواب آپ پائیں گی۔

خوش ہوں کہ نقاد اور نوٹ پسند آیا

آئندہ غلو سے کام نہیں لوں گا۔ اس باضابطہ انتباہ کا شکریہ ہمیشہ ٹوکتی رہیے میں یہی بات آپ سے چاہتا ہوں۔

تیسرا پرچہ آپ کے مضمون کا منتظر تھا۔ اب جلد شائع ہوگا۔ بخدا اگر آپ اس میں جلوہ گر نہ ہوتیں تو میرے ملال کی کوئی حد نہ ہوتی۔ بہ وقت دسواں (؟) نے جیت لیا۔ دیوان حسرت بھیجتا ہوں رسید دیجئے اور تنقید لکھ ڈالئے کوئی اور چیز بھی تنقید کے لئے جلد روانہ کروں گا۔

آپ جلد جلد لکھتی رہیے پھر تعمیل ارشاد میں کوتاہی کروں تو مجرم۔ کیا گیتانجلی آپ کو نہیں ملی۔ اگر مل گئی ہو تو اس پر ریویو کر دیجئے میں ممنون ہوں گا۔ اردو لٹریچر شکر گزار ہوگا۔

پوری کیفیت کا منتظر ہوں۔ دیکھئے یہ بیگانگی کب دور ہوتی ہے۔ بیگم حسرت نے مجھے لکھا کہ میں ت۔ مانی صاحبہ سے ملنے آگرہ آتی ہوں۔ میں نے انہیں

لے: اس مضمون کی طرف اشارہ ہے جو بہ عنوان "کچھ اپنی نسبت" پچھلے صفحات میں نقل ہو چکا ہے۔ یہ نقاد کے تیسرے شمارہ یعنی جون ۱۷ء میں شائع ہوا۔ ت۔ زمانی کے عورت ہونے میں جن لوگوں کو شبہ تھا انہیں اس مضمون میں جواب دیا گیا ہے۔

(دیوان حسرت) لکھا کہ وہ آگرے میں نہیں ہیں۔ آج ہی خط آیا جس میں پوچھا ہے وہ کب تک آگرہ تشریف لائیں گی۔ میں ان سے ملنے کی مشتاق ہوں۔

آپ ہی فرمایئے کیا جواب لکھوں۔

آپ کا غلام

"دلگیر"

قمر زمانی نے اس خط کا جواب ۲۸ جون کو دیا۔ قمر زمانی کے خط میں دلگیر کے خطوط مرقومہ ۱۵ جون، ۲۶ جون اور ۲۳ جون کا ذکر ہے۔ ۲۲ جون کا خط اوپر درج ہے اور ۱۵ جون کا خط اس سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ دلگیر کا خط مرقومہ ۲۲ جون مسودات میں نہیں ہے۔ بہر حال قمر زمانی کا خط دیکھئے۔

۷ رمضان المبارک

۲۸ جون ۱۷ء

مجھے آپ کا خط ۱۵ جون کا بھی مل گیا تھا اور ۲۲ و ۲۳ کے بھی مل گئے گلستان جلی پہنچ گئی تھی اور دیوان حسرت بھی پہنچ گیا۔ مگر صرف اتنا ہی کلام ہے اور ہو گا؟ کیا دیوان مکمل شائع نہیں ہوا؟ ریویو بھی کروں گی۔ مضمون بھی لکھوں گی مطمئن رہیئے لیکن دیکھئے کبھی یہ نہ کیجئے کہ میرے مضمون کے انتظار میں پرچہ کو دیر سے شائع کیجئے۔ اس کا بہت برا اثر پڑے گا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ اس بار تاخیر کی وجہ یہ انتظار ہے ورنہ میں کبھی مضمون روانہ نہ کرتی اور آپ کو مجبور کرتی کہ بغیر میرے مضمون کے شائع کر دیجئے۔ اس میں اور بھی بہت سے منافع ہیں جن کو میں خوب جانتی ہوں اور شاید غور کرنے سے آپ بھی جان جائیں۔ جو مجھے نمبر کے لئے کیا لکھوں۔ دیکھئے اور خود سمجھ لیجئے کہ میں نے کیا پوچھا تھا اور آپ کیوں برہم ہو گئے تھے۔ آپ زیادہ نہ بنا کیجئے۔ جان بوجھ کر یہ چڑانا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اگر آپ کو میری باتوں کا جواب دینا ہے تو جلد دیجئے زمانہ قریب ہے۔

"قمر"

یہ خط ۲۸ جون کا ہے۔ دلگیر کے جواب کا تین دن انتظار کر کے قمر زمانی نے اسی کے ساتھ ایک اور مختصر سا خط پوسٹ کیا اور ایک تازہ مضمون بھی نقاد کے لئے منسلک کر دیا۔ پہلے خط دیکھئے۔

یکم جولائی ۱۷ء

حضرت دنگیر سلمہٗ

لیجئے چوتھے نمبر کے لئے بھی مضمون حاضر ہے۔ اب تو کوئی شکایت نہ ہوگی آپ دیکھیں گے کہ اس مضمون کا دوسرا رنگ ہے۔ پہلا[1] اور تیسرا[2] مضمون کاروباری لٹریچر تھا۔ دوسرا[3] مضمون نزاکت تخیل کا نمونہ تھا اور یہ صرف جذبات کا۔ آگے آگے دیکھتے جائیے۔ یہ آپ کی جنس کو پریشان نہ کر دوں تو سہی، میرے پچھلے خطوں کا جواب ہنوز واجب ہے۔

"قمر"

قمر زمانی نے اس خط میں اپنے جن مضامین کا ذکر کیا ہے ان میں سے پہلا دوسرا اور تیسرا مضمون پچھلے صفحوں میں درج ہو چکا ہے۔ چوتھا مضمون جو اس خط کے ساتھ دلگیر کو بھیجا گیا "ساون کی ایک رات" ہے، یہ نقاد کے چوتھے شمارے بابت جولائی ۱۷ء کے لئے لکھا گیا ہے۔ مضمون دراصل ہندو لڑکی کے جذبات کی نمائندگی کرتا ہے۔ دلگیر نے اس مضمون پر مندرجہ ذیل نوٹ لکھا ہے۔

"ادیب جمیل قمر زمانی کا یہ چوتھا مضمون ہے اور آپ دیکھیں گے کہ اس کا دوسرا رنگ ہے۔ پہلا اور تیسرا مضمون کاروباری لٹریچر تھا۔ دوسرا مضمون نزاکت تخیل کا نمونہ تھا اور یہ صرف جذبات کا۔ آگے آگے دیکھتے جائیے کس قدر پاکیزہ اور دلکش آپ کی زبان میں جمع ہوا جاتا ہے۔"

اس نوٹ کے سارے فقرے قمر زمانی ہی کے خط سے ماخوذ ہیں اور انہیں خوش کرنے کے لئے اخذ کئے گئے ہیں۔ اب قمر زمانی کا اصل مضمون دیکھئے۔

ساون کی ایک رات

وہ تاریک اور سنسان رات جب میں اکیلی لیٹی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی، آہ وہ رات بھی کیسی عجیب رات تھی۔ بارش کا شور مگر کس قیامت کا سکون۔

---

[1]: "افتتاحیہ نقاد" مطبوعہ نقاد بابت اپریل ۱۹۱۷ء

[2]: "کچھ اپنی نسبت" مطبوعہ نقاد بابت جون ۱۹۱۷ء

[3]: "اے کلی" مطبوعہ نقاد بابت مئی ۱۹۱۷ء

تاریکی ایسی تاریکی کہ جدھر نگاہ اٹھا کے دیکھو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کاجل برس رہا ہے۔ کبھی نہ بھولوں گی۔ وہ کڑک اور بجلی جب میں ایک کونے میں پڑی تھر تھر کانپ رہی تھی اور ہمیشہ یاد رہیں گے۔ وہ بادل جن کے ساتھ ساتھ میرے سحاب مژہ سے آنسو امنڈے چلے آرہے تھے۔ "پیارے تم مجھے ایسے وقت میں بھی چھوڑ کر چلے گئے۔ میں نے تو تمہیں کبھی مجبور نہیں کیا کہ میرے دھڑکتے ہوئے دل پہ ہاتھ رکھو۔ میں نے تو کبھی تم سے یہ آرزو نہیں کی کہ میرے آنسو اپنے دامن سے پونچھ لو۔ پھر میں اس وقت بھی تمہیں کیوں ستانے لگی تھی۔ لیکن تمہارا میرے پاس ہونا۔ صرف یہ علم کہ تم مجھ سے دور نہیں ہو۔ میرے لئے تو یہی بہت ہے۔ میں نے تو تمہاری بیگانگی کو بھی ہمیشہ پیار کیا بلکہ تم جس قدر الگ الگ رہے۔ میری محبت اسی قدر بڑھتی گئی۔ میں تو ہمیشہ یہی سوچ کر تسکین دل کر لیا کہ تم مجھ سے شرماتے ہو اس لئے پاس نہیں آتے۔ محبت تو کچھ نہ کچھ ضرور ہے مگر یہ نہ سمجھتی تھی کہ اس بھری برسات میں اس کڑک اور بجلی میں یوں مجھے اس جھونپڑے میں تنہا چھوڑ جاؤ گے۔ مگر میں تو اب بھی شکایت نہ کرتی اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ نہ جانے تم کہاں اور کس حال میں ہو۔ کہیں تم جنگل میں ابھی تک سفر ہی نہ کر رہے ہو۔ کہیں تم بھیگ نہ رہے ہو۔ میں نے کس قدر روکا کہ نہ جاؤ اپنے خیال سے نہیں صرف تمہارے خیال سے لیکن تم نے نہ سنا اور چل دیئے۔ کون تھا۔ آخر اس گاؤں میں ایسا بلانے والا جس کی دعوت تم ایسے موسم میں بھی رد نہ کر سکے۔ اسے غریب رادھا کی تنہا دولت و مسرت کہیں تم اپنے تئیں کوئی ضرر نہ پہنچا لو کہ وہ مر جائے۔ اس نے تو اپنے عزت کے دن بھی شاہانہ فخر و غرور کے ساتھ کاٹ دیئے صرف اس خیال پر کہ تم اس کے مالک ہو۔ اس نے تمہارے پیچھے دنیا کو ٹھکرا دیا کہ اس کی دولت تو صرف تمہارا ہی حسین چہرہ ہے۔ لیکن سچ بتانا کبھی تم نے بھی اس کو اپنی لونڈی سمجھا یا نہیں۔ تمہیں شاید گرمی کی وہ رات یاد نہ ہو جب تم سو رہے تھے اور تمہیں میٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ یہ ہوا اس گھڑی کا جب صبح ہوتے میں تمہارے اوپر اونگھ گئی اور پنکھے کا کونہ تمہاری پیشانی سے چھو گیا۔ میں چونکی تو کانپ گئی۔ دیکھئے اب کیا ہو اور تم نے غصہ ہو کر میری کلائی مروڑ ڈالی۔ میں سہم کر رہ گئی اور تم پھر سو گئے۔ آہ! میں اس وقت کیسی خوش تھی کہ تمہارے

ہاتھ تو میری کلائی تک پہنچے۔ اگر تمہاری تکلیف کا خیال نہ ہوتا تو میرا جی چاہتا تھا کہ پھر تمہیں اسی طرح جگاؤں اور تم پھر مجھے سزا دو۔ مجھے مارو تمہیں پچھلے جاڑوں کی بات یاد نہ رہی ہوگی جب تم شام کو کانپتے ہوئے باہر سے آئے اور میں نے دونوں کمل تمہارے اوپر ڈال دیئے، تم سو گئے میں نے ساری رات یونہی بیٹھ کر کاٹ دی اور کچھ پرواہ نہ کی کہ ایک رات بغیر کمل ہی کے سہی تمہیں تکلیف نہ ہو۔ صبح ہوتے تمہاری آنکھ کھلی تو تم نے مجھے جھونپڑے میں نہ پایا۔ میں باہر کچھ پتیاں جمع کرنے گئی تھی کہ انہیں جلاؤں اور سردی کا مقابلہ کر سکوں۔ تم نے آواز دی، غصہ کی آواز سے پکارا۔ میرے دامن سے پتیاں چھوٹ پڑیں اور ویسی ہی بھاگی چلی آئی۔ میں تمہاری غصہ ناک چتون دیکھتے ہی سہم گئی اور یہ نہ کہہ سکی کہ کیوں باہر گئی تھی۔ آہ تم نے مجھے مارا۔ میں مار کھایا کر اور اپنی حماقت پر خوب روئی۔ میں نے اس پر آنسو نہیں بہائے کہ تم نے کبھی مجھ پر رحم نہیں کیا۔ کیونکہ میں نے اپنے تئیں کبھی اس قابل سمجھا ہی نہیں۔ میں نے تو ہمیشہ تمہارا احسان ہی مانا کہ تم نے مجھے چھوڑ نہیں دیا میں کیا کرتی اگر تم مجھے گھر سے نکال دیتے، ٹھکرا کر باہر کر دیتے۔"

یہ تھے وہ جذبات جو اس وقت رات کی تاریکی، بارش کے سناٹے اور جھونپڑے کی تنہائی میں میری آنکھوں سے جاری تھے۔ مجھے نہیں معلوم کس وقت رات کا کس قدر حصہ گزر جانے کے بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں ڈر گئی کہ یہ کون ہے وہ بھلا کہاں، مگر جب آنے والے نے آواز دی تو میں حیران رہ گئی کہ اس وقت کہاں گھبرا کر اٹھی کہ پر میسر خیریت کرنا میں تو اس وقت سب کچھ بھول گئی اور دروازہ کھولتے ہی نہال ہو گئی جب دیکھا کہ وہی ہیں اور خیریت سے ہیں۔

میں ڈر رہی تھی کہ کہیں خفا نہ ہوں۔ لیکن میری خوشی کا کیا ٹھیک تھا جب انہوں نے مسکراتے ہوئے مجھ سے میرا حال پوچھا میں کانپنے لگی اور رونے لگی میری حالت تو اور خراب ہونے لگی جب انہوں نے مجھے اپنی آغوش میں لے کر آنسو بھی پونچھے اور دھڑکتے ہوئے سینہ پہ ہاتھ بھی رکھا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں انہیں کیا دے دوں، اس محبت کو میں کس طرح اپنی جان سونپ دوں۔ ــ آہ مجھے کیا خبر تھی کہ کسی اور پر غصہ مجھ پر التفات دوسرے کی بے وفائی

میری دعا اور اس گاؤں کی لڑکی کا فریب میرا خلوص نکلے گا۔

(ایک ہندو لڑکی کی حیثیت سے)

"قمر زمانی"

جولائی کے نقاد میں قمر زمانی کے اس مضمون کے علاوہ اور کئی مضامین خواتین کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ یہ سب جذبات نسوانی کے ترجمان ہیں اور مولانا نیاز فتح پوری ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ ایک مضمون قمر زمانی کے مضمون "اے کلی" مطبوعہ مئی ۱۹۱۷ء کے جواب میں ہے اس کا عنوان "پژمردہ کلی کا جواب" ہے۔ نیاز نے یہ انشائیہ "گلستاں" کے نام سے چھپوایا ہے۔ دلگیر نے اس پر حسب ذیل نوٹ لکھا ہے:۔

اس مضمون میں جذبات کی لطافت خیال کی نزاکت اور انداز بیان کی حلاوت خود غمازی کر رہی ہے کہ جنس لطیف کا لکھا ہوا ہے۔ صاحب مضمون اپنا اصلی نام ظاہر کرنا نہیں چاہتیں۔ لیکن وعدہ کرتی ہیں کہ نقاد میں برابر مضامین لکھتی رہیں گی۔ میں خوش ہوں کہ کلی کی طرف سے جواب پاکیزہ۔ خدا کرے کلی والی کو بھی پسند آئے۔

"دلگیر"

اب اصل مضمون دیکھئے:۔

"پژمردہ کلی کا جواب"

مجھے نقاش فطرت نے ایک شب ہاں صرف ایک شب زندگی بسر کرنے کے لئے دنیا میں بھیجا۔ اس سے پہلے دیکھنے والوں کی نگاہوں میں میری حقیقت کچھ نہ تھی۔ مجھے لوگ صرف "مجموعہ انتشار" سمجھتے تھے۔ مگر اب تو سارا عالم میرا شیدائی ہے "کسی" سے اپنی تعریف میں نے بھی سنی جس سے میرا مرجھایا ہوا دل پھر کھل گیا۔ اب میرے دلی جذبات بھی سنیئے جن کو صرف میں ہی بیان کر سکتی ہوں۔

تمہارے یاسمینی سینہ پہ بال میں کلی ضرور کھلی

تمہارے دھڑکتے ہوئے سینہ کی حدت نے مجھے قبل از وقت کھلا دیا اور مرجھا بھی گئی کہ مجھ سے تمہارا اس طرح سونا نہ دیکھا گیا۔ اب تمہیں مجھ سے گلہ ہے شکوہ ہے۔ بیشک ہوگا لیکن آہ! باوجود تمہارے شگاف سینہ پر پر کھلنے اور مرجھانے کے تمہیں خبر ہی نہیں کہ میں کس وقت کھلی اور کب مرجھائی۔

طرہ یہ کہ تم نے میری ننھی ننھی جنبش کو بغور دیکھا اور اس وقت بھی میری خبر نہ لی میں بہتی تھی تو تمہارا دل دھڑکتا تھا۔ نہیں تمہارا دل دھڑکتا تھا تو مجھے جنبش ہوتی تھی مجھ میں اس وقت اتنی حس و حرکت کہاں تھی کہ سرکشی۔ میں چین سے سونے والوں کی بیخبری پر رشک کر رہی تھی کہ مجھ جیسی ہزاروں کلیاں اسی طرح ہر شب تمہارے دل گداز سینہ پر کھل کر اور مرجھا کر خاک میں مل گئی ہوں گی۔

تم مہ جبیناں عالم کو کیا اور کوئی نہیں ملتا کہ ہم دل گرفتوں اور بے زبانوں کو روز ستاتے ہو۔ تنگ کرتے ہو۔ تمہیں ہار ہو تو ہمارا ہی ہو۔ بازو بند چاہیے تو ہماری ہی چاہیے پہونچی بنے تو ہماری ہی بنے۔ سیج بچھے تو ہماری ہی بچھے۔ سنگھار ادھورا ہی رہ جائے جو ہم نہ ہوں غرض ہمارے بغیر کل ہی نہیں۔

آہ جب تم نے میری بیتابیوں اور آہوں سے خاموش لوریوں کا سا لطف اٹھایا اور سو گئیں" اس وقت میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ میں "نقرئی جھوٹی سی کشتی" تھی میری بساط ہی کیا ہے۔ مگر ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ تمہارا شفاف سینہ "سطح آب" نہ تھا تمام رات تم بے فکری سے سویا کیں ہائے نہ میرا کھلنا دیکھا نہ مرجھانا۔ صبح ہوتے ہی تمہاری نگاہ مخمور سب سے پہلے مجھ دل شکستہ ہی پر پڑی اس نظر التفات کا کیونکر شکریہ ادا کروں۔

اٹھ سوتے ہوئے میں نے تمہیں جس رنگ میں پایا جو بات دیکھی دیکھی اب اس خواب کا خیال ہی کیا۔ جب میں ہی ہمیشہ کی نیند سو گئی تو تمہارے سونے کی تعریف کس طرح کروں۔

ابھی طرح جب صبح ہو گئی رات ختم ہو چکی تو تم کہتی ہو "کاش میں تجھے دیکھ سکتی جب تجھ میں اول اول جنبش شگفتگی پیدا ہوئی میں اندازہ کر سکتی کہ تیری قبائے احرام کیونکر تار تار ہوئی"۔

پیاری اس وقت تم نے بات بھی نہ پوچھی جب میں تڑپ تڑپ کر زبان حال سے کہہ رہی تھی ؎

عالم عیش میں او چین سے سونے والی
چاک ہے مثل سحر دیکھ گریبان کس کا

آہ تم اب پوچھتی ہو کہ "میں پھر کلی ہو سکتی ہوں" نہیں میں نہیں ہو سکتی۔ میری اچھی

چاہنے والی ۔ فنا کے بعد بقا ممکن نہیں ۔ جب مرمٹ چکی تو پھر زندگی کہاں ۔ سوکھنے کے بعد ہری کس طرح ہو سکتی ہوں ۔ مگر تم غم نہ کرو ۔ میرے لئے اپنا ننھا سا دل نہ کڑھاؤ ۔ تمہیں تو ہر روز وہی مسرت حاصل رہے گی ۔ تمہاری ہر رات میری نئی ہمجولیوں کے ساتھ بسر ہوگی ۔ مگر ہاں نہ میرا رنگ ہوگا نہ میرا روپ اور نہ میری بو ۔

یہ تمہاری وفاداری ہے کہ میرے پژمردہ ہونے پر میرے سوکھنے پر بھی تم نے مجھے وہاں رکھا جہاں تم کاغذ پہ اب بھی خواب ہی دیکھ رہی ہو اور میں اس صلہ جاں نثاری سے کتنی خوش ہوں کہ میری خاک بھی تمہارے دامن میں رہے گی ۔ اگر میرا بس چلتا تو میں ہر شب نئی زندگی حاصل کرتی اور تمہارے سینہ پر بجائے دوسری کلیوں کے خود رہا کرتی ۔ کیا یہ رشک مجھے فنا ہونے کے بعد بھی چین لینے دے گا ۔ میری سوکھی ہوئی پتیاں جل جل کر اور خاک سیاہ ہو جائیں گی جب یہ دیکھوں گی کہ ہر شب تمہارے دماغ کو کوئی دوسرا پھول تر و تازہ کر رہا ہے ۔

تم جانتی ہو کہ میں کس باغ کا درخت اور کس شاخ کی کلی ہوں ۔ نہیں تمہیں کیا خبر ۔ اچھا مجھ سے سنو ۔

"ایک چھوٹی سی بستی جس کا نام "عشق آباد" ہے وہاں ایک باغ ہے "گلشن محبت" کسی رنگیلے کا لگایا ہوا ۔ اس کی مالک و حکمران ایک حسین شہزادی ہے ۔ جس کی نازک خیالی و حسن کا تمام عالم میں شہرہ ہے وہ "ملکہ شمس" کہلاتی ہے اسے پھولوں کا بے حد شوق ہے اور اس کے گلشن محبت میں پھول ہی پھول کھلے ہوئے ہیں ۔ چمپا ، چنبیلی ، بیلا ، موتیا ، موگرا ، جوہی ، گل شبو ، گلاب کے درخت اس نے اپنے دست سیمیں سے لگائے ہیں ۔ جب ان درختوں میں پھول کھلے تو خود شہزادی "شمس" اپنی سہیلیوں کے ساتھ گلشن محبت کی گل چینی کو چلی ۔ باغ میں اس یوسف ثانی کے قدم رکھتے ہی تخلیہ ہو گیا ۔ سہیلیوں کے ہمراہ شہزادی شمس خراماں خراماں مصروف گلگشت اور ٹہلتے ٹہلتے اس درخت کے پاس پہنچی جس درخت کی ایک لچکدار اور جھکی ہوئی شاخ میں اسے ایک کلی نہایت ہی خوبصورت اور خوشبودار نظر آئی ۔ یہاں پہنچتے ہی وہ ٹھٹکی ، جھکی اور شاخ گل سے مجھے توڑ لیا ۔ وہ کلی ہائے وہی خوش نصیب کلی جسے آج تم نے اپنے سینہ پر کھلا ہوا پایا ہیں تھی ۔

اب معلوم ہوا میں کون ہوں۔

تمہارے سینہ پر میں نے ایک رات بسر کی ہے۔ اسی لئے دوسری ناشگفتہ کلیوں سے افضل اور مر کر زندہ جاوید ہو گئی۔ ہاں میری اچھی محسنہ تو مجھے وہیں بھیج، جہاں تجھ سی خوش رنگ و خوشبو خوش نصیب کلی کے رہنے کے لئے قسام ازل نے بائیں پہلو میں تنہا سا مزار میری پیدائش سے قبل بنا کر تیار کر رکھا ہے۔ میں وہیں آرام کروں گی۔

"یہی ہے اس شب کے خواب کی تعبیر"

"کہکشاں"

اس پرچے میں ایک اور انشائیہ، اسی انداز کا ثریا کے نام سے ملتا ہے۔ یہ شعر منثور بھی دراصل مولانا نیاز فتح پوری کی تخلیق ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ قمر زمانی کے نام سے لکھ رہے تھے، دوسری طرف دلگیر کے دونوں کو تازہ رکھنے اور قارئین نقاد کو قمر زمانی کے عورت ہونے کا ثبوت فراہم کرنے کی غرض سے "نقاد" کے قلمی معاونین کی فہرست میں نئی خواتین کے نام شامل کروا رہے تھے۔ ان ناموں کے پس پردہ مولانا خود ہی تھے "پژمردہ کلی جواب" دیکھ چکے۔ اب "اے مخلوق محترم ترین" دیکھئے وہ کہکشاں کے نام سے چھپا تھا۔ یہ ثریا کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس پر بھی دلگیر کا ادارتی نوٹ اس طور پہ ملتا ہے۔

"یہ لطیف مضمون بھی صنف نازک کے ایک فرد کا لکھا ہوا ہے جسے ہم شکریہ کے ساتھ بجنسہٖ شائع کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ آئندہ بھی نقاد کے صفحات ان پاکیزہ خیالات سے محروم نہ رہیں گے۔

"دلگیر"

اس کے بعد مضمون شروع ہوتا ہے۔ اسے دیکھتے چلئے۔

"اے مخلوق محترم ترین"

مدتیں گزر گئیں، زمانہ ہو گیا، مگر یہ راز بدستور سربستہ ہی رہا کہ جو فضیلت اور رتبہ انسان کو میسر ہوا ہے کیا وہ اسی کا حصہ ہے۔ اس نے فرشتوں سے بھی بازی جیت لی لیکن کیا اس نے اپنے اس اعزاز اور امتیاز کی بھی کچھ قدر و منزلت بھی کی ہے۔ نہیں واللہ انسان بڑا سرکش ہے۔

کیا یہ اپنے بائیں پہلو میں تڑپنے والے سیماب پر ہاتھ رکھ کر یہ نہیں دیکھ سکتا کہ وہ کن کن آفات میں مبتلا ہے اور اس کی زندگی کس کس کش سے ملتفت

ہے۔ زندگی آہ کیا فنا ہونے والا لفظ ہے۔ اگر تجھے نظرِ غور سے دیکھا جائے تو تو موت سے کہیں بدتر ہے۔ وائے زندگی تو شب و روز اپنا قیمتی وقت مختلف بکھیڑوں میں گزار دیتی ہے۔

اے انسان — نہیں نہیں تو اس مقدس القاب کے لائق نہیں ہے بلکہ اے مشتِ خاک تو کیوں اپنا وقت کائنات آفرین کے ذکر میں نہیں گزارتا کہ اس پاک اور نیک تذکرہ سے تیری عاقبت بے خبر ہے۔ نہیں تو ان مقدس رسومات کا عادی نہیں۔ تجھ سے التجا کرنا بے کار ہے۔

دلوں گزر گئے اور مجھے انہیں تفکرات نے پریشان رکھا کہ انسان کس برتے پر اپنی قوم کو تمام اقوام پر ترجیح دیتا ہے۔ اس کی نفیلت کا کیا ثبوت ہے۔ آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ دنیا میں جس قدر برائیاں ہیں وہ انہیں ذات مقدس کی بدولت ہیں۔ خیر سے حسنات بھی ان میں موجود ہیں لیکن خوابات سے کم۔

اے وجودِ سرکش تیرے قلب میں غرور ہے اور تو حرص و تمنا کا پتلا بنا ہوا ہے۔ جس کو بجائے آزر کے نشترِ سرکشی نے تراشا ہے۔ اُف — تو باوجود سیر ہونے کے بھی خود غرض کا بندہ بنا ہوا ہے حیف تیری اس غلامی پر۔

اے رب العجائب کی ایک حقیر و ناچیز مخلوق کیا تو بھی اپنے معبود کی پرستش کرتی ہے اور کیا تو بھی اس کی عبادت میں سرگرم و مشغول رہتی ہے میں جانتی ہوں تیرے پاس اس کا جواب نفی میں ہے۔

اے خود بین دیکھ کون سی عبادت سے بری ہے۔ آہ عبادت تو پتھر، کنکر، روڑے، نباتات، جمادات بھی بجا لاتے ہیں۔ پانی تسبیح و تہلیل میں مشغول ہے، آگ سجدے میں ہے۔ پہاڑ سرنگوں ہیں، چٹانیں رو رہی ہیں۔ لق و دق جنگل دعا مانگ رہے ہیں۔ الغرض ہر مخلوق خوفِ خالق سے سربسجود و لرزاں ہے۔ پھر کیا سبب ہے کہ اے ناداں انسان تو غافل اور سرمستِ نشاط نظر آتا ہے۔

افسوس۔ انسان کے سوا اور کون مخلوق ہے جو اپنے رب سے انکار کرنے کی جرأت کرے۔ آپ ہی بتلائے اور کون دھریہ ہے اور کون فلسفہ اور سائنس کے زور پر خدائی کاموں کو اتفاقات سے تعبیر کرتا ہے اور کون ہے جو احکامات ربانی سے منحرف ہے۔

یہ اسی ناشکرے کا حوصلہ ہے کہ باوجود بے پایاں الطافِ صمدی اور اکرامِ سرمدی کے کبھی شکر گزار نہیں ہوتا۔ ہمیشہ شاکی ہی رہتا ہے اور اپنی ناچیز ہستی کے گھمنڈ پر خدا کی طاقت در ہستی کو فراموش کر دیتا ہے۔ معاذ اللہ۔

جس تہذیب پر اس کو ناز ہے وہ سوائے اس کے کیا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کو سادگی سے علیحدہ کر کے عمیق پیچیدگی میں لا ڈالا ہے۔

اے مخلوق محترم ترین

غالباً تجھے اس بات پر فخر ہو گا کہ فنا اور بقا میں تیری اور اقوامِ دیگر کے یہ فرق ہے کہ تجھ کو فنا نہیں اور دوسری قوموں کو بقا نہیں مگر اپنی اخلاقی حالت تجھ سے سن ایک مذہب والا دوسرے مذہب والے سے فساد کر رہا ہے۔ بہشت و دوزخ کے مناقشوں میں انسانیت کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ حشر اجساد یا حشر ارواح سے پہلے ہی ایک حشر برپا ہے۔ کیا تو اسی ہستی ناپائیدار پر اترا رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ کبھی فنا نہ ہو گا۔

دیکھ اب بھی وقت ہے، درِ استغفار کھلا ہوا ہے۔ خدا کے قہر و غضب سے ڈر اور توبہ کر۔ اے ہوس کے بندے اے غرض کے پتلے۔

"سچ یہ ہے کہ خلوص و محبت تجھ میں نام کو نہیں"

یہ کہہ کر میں رخصت ہوتی ہوں اور میں مٹ جانے کے لئے تجھے تنہا چھوڑے دیتی ہوں۔

"ثریا"

جولائی کے نقاد میں ایک اور مختصر سا مضمون آخری صفحے پر چھپا ہے۔ اس کے نیچے "فرقت نصیب بلقیس" لکھا ہوا ہے لیکن ہے یہ بھی نیاز فتح پوری کا۔ بلقیس کا نام فرضی ہے۔ اس مضمون کا عنوان ہے "مجھ مہجور کی عید" اس میں ایک ایسی عورت کے جذبات کا اظہار ہے جو عید کی خوشی کے موقع پر اپنے محبوب سے دور ہے اور فراق کی زندگی بسر کر رہی ہے اصل مضمون یہ ہے:۔

"مجھ مہجور کی عید"

ایک سال کے کٹھن انتظار کے بعد، بارہ مہینے کی ناقابلِ برداشت جدائی کے بعد، میں رمضان شریف کے آنے کے انتظار میں دل تھامے ہوئے۔ آنکھیں بچھائے ہوئے بیٹھی تھی۔ خدا خدا کر کے چاند دیکھا۔ آنکھوں کو ٹھنڈک دل کو سکھ ہوا کہ

اب کی عید میری زندگی کا سہارا بننے والی تھی۔ اب یہ بے صبری تھی کہ اللہ یہ مہینہ کب ختم ہوگا اور عید کا چاند دونی مسرت لئے ہوئے میرے کاشانہ غم کی تاریکی دور کرنے اور میرے سیہ خانہ میں روشنی پھیلانے کب نمودار ہوگا۔

"عیدین" ہاں میری دو عیدین ہوں گی۔

ایک عید جو دنیا کی عید ہے اور دوسری عید جو صرف میری ہاں "عید" میری ہے وہ میرے ...... کی "دید ہوگی۔ سب سے بڑھ کر عید تو اس فرقت زدہ کی وہی تھی اور ہوتی مگر میں اپنی قسمت کو کیا کروں جس نے میرے ساتھ دغا کی مجھے دھوکا دیا میری خوشی اس سے دیکھی نہ گئی۔ میری حسرتوں کی صبح سے پہلے ہی شام ہوگئی۔ میرے ارمانوں کا خون ہوگیا میری زندگی موت سے بدتر ہوگئی۔

"وہ چلے گئے"

کسی کے تڑپنے کا "انہیں" خیال تک نہ آیا۔ کسی کو روتا چھوڑ کر، مجھے حیرت ہے "ان" کے قدم آگے کس طرح بڑھے، کوئی ان کے فراق میں مرے یا جیے۔ انہیں اس کی پروا نہیں لے

اُف آج سے صرف ایک ہفتہ عید میں باقی رہ گیا مگر دنیا کی عید کے لئے نہ کہ مجھ مہجور کی مجھ غم زدہ کی ہائے مجھ مہجور کی اصلی اور سچی "عید" خدا جانے کب ہوگی۔ جس روز میرے مالک کو مجھ پر ترس آئے گا اسی روز میری "عید" ہے۔

اے تڑپنے والے دل۔ تیری بے قراری سے توقع تھی۔ تیری جاذبیت و کشش سے امید تھی کہ تو آنے والے عید کے چاند کے ساتھ میرے "چاند" کو بھی دکھا دے گا ہمیشہ کے لئے مجھے ملا دے گا آہ سے

سب خاک ہوئیں آج مرے دل کی امیدیں ۔۔۔ کل تک تو تری ذات سے کیا کیا نہ یقین تھا

میری پامال حسرتو۔ جاؤ۔ میرے خون شدہ ارمانو۔ رخصت ہو۔ اب اس مایوس نامراد دل میں تمہارا کچھ کام نہیں۔ میں بھی اس دنیا کو جلد چھوڑنے والی ہوں۔

اے جامع المتفرقین۔ تیرے آگے کوئی بات محال نہیں تو اس بے کس کے

لے: اس مضمون میں دستگیر کو قمر زمانی سے پہلی ملاقات کی یاد دلائی ہے اور شوال کے پہلے ہفتے میں قمر زمانی نے دستگیر سے ملنے کا جو وعدہ کیا تھا، اس وعدے کو پورا کرنے کا یقین دلایا گیا ہے۔

لئے خوشی کا سامان مہیا کر یا پھر موت دے قصہ پاک کر۔

"فرقت نصیب بلقیس"

پچھلے صفحوں میں دلگیر کا خط مرقومہ ۲۲ر جون اور اس کے جواب میں قمر زمانی کے خطوط مرقومہ ۲۸ر جون اور یکم جولائی نقل کئے جا چکے ہیں۔ اس کے بعد مسودات میں دلگیر کا کوئی خط نہیں آتا۔ قمر زمانی بھی تقریباً دو مہینے بالکل خاموش رہی ہیں۔ یعنی جولائی اور اگست کے مہینوں کا کوئی خط دستیاب نہیں ہے۔ ۹ر ستمبر کا لکھا ہوا ایک خط البتہ مسودات میں موجود ہے۔ یہ القاب آداب سے خالی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قمر زمانی اور دلگیر کے درمیان فاصلے بڑھ گئے ہیں۔ دلگیر کو قمر زمانی کی حقیقت کا کچھ علم ہو چکا ہے۔ تاہم قمر زمانی اپنا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ قمر زمانی کا خط مرقومہ ۹ر ستمبر دیکھئے:-

۹ر ستمبر ۱۷ء

مجھے یقین ہے کہ آپ بہت برہم ہوں گے اور ہونا چاہئے لیکن جب آپ کو پورا حال معلوم ہوگا تو غالباً آپ معاف فرمائیں گے۔ میرا سارا رمضان قریب قریب سفر میں کٹا اور شوال کا اتنا حصہ دیگر تقریبات میں جو میرے خاندان میں ہوئیں اور ہو رہی ہیں۔ میں پورا انتظام ڈاک کا کر گئی تھی لیکن میرے غصے کی کوئی انتہا نہ تھی۔ جب واپس آ کر معلوم ہوا کہ میرے نام کی ساری ڈاک تلف ہوگئی جس میں یقیناً آپ کے خطوط بھی ہوں گے۔ بعض خطوں کے چند پرزے ملے لیکن وہ آپ کے نہ تھے۔ قصہ یہ ہوا کہ جس خادمہ کے سپرد یہ کام کر گئی تھی اس نے احتیاط نہیں کی اور اس کے بچے نے کچھ خط پھاڑ ڈالے اور کچھ جلا دیئے۔ میں سوائے اس کے اور کیا کر سکتی تھی کہ خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتی۔ خدا کے لئے دلگیر صاحب معاف کر دیجئے۔ مجھے سخت الجھن رہے گی جب تک آپ معاف نہ کر دیں گے۔ میں نے ایک غزل روانہ کی تھی معلوم نہیں پہنچی یا نہیں۔ اب آپ مفصل خط لکھئے کہ اس زمانہ میں کیا کیا ہو گیا، تاکہ مجھے بھی تفصیل کیساتھ جواب دینے کی ہمت ہو۔

جولائی کا پرچہ جلد شائع فرمایئے سخت انتظار ہے۔

(پتہ وہی ہے)

خطا دار

"قمر"

قمر زمانی کے اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ دلگیر کی طرف سے خاموشی کی مصلحت وابستہ ہے۔ شاید ان کو اصل حقیقت کی خبر ہو گئی ہے یا یہ کہ شبہ تو ہی ہو گیا ہے اس لیے انھوں نے قمر زمانی کو مزید کچھ لکھنا پسند نہیں کیا۔ قمر زمانی نے اوپر کے خط میں جس غزل کا حوالہ دیا ہے وہ دلگیر کو موصول ہو گئی تھی۔ نقاد کے پانچویں شمارے میں یہ عنوان افکار جمیلہ چھپی ہے۔ غزل یہ ہے:

افکارِ جمیلہ

دل ہی ہو چکا ان کا پھر کیسی وفا کیشی
اب درسِ تغافل دے اے مصلحت اندیشی

کیا کہتے ہو تم کس کو ہے شکوۂ دل ریشی
فرماتے رہو تم تو تجدید ستم کیشی

وہ چارہ گری کرتے لیکن اسے کیا کیجے
میں آپ لکھا لائی تقدیر میں دل ریشی

ہے روح بدن میں اک ہر لحظہ خلش غم کی
اے عشق رگ جاں ہے یا تیری الم نیشی

شب تیرے تصدق میں پہنچی تو ہیں اس در تک
احسان ہے ترا مجھ پر اے جامۂ درویشی

ہاں سرد ہوئے اعضا ہاں نزع میں ہوں لیکن
اک دل ہے کہ اب بھی ہے گرم تپش اندیشی

رائج ہے ترے دم سے وابستہ قمر ہے یہ
قانونِ ستم تازہ آئینِ وفا کیشی!

اس پرچے میں غزل کے فوراً بعد ایک صفحے کا انشائیہ "کوثر" کے فرضی نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ بھی نیاز فتح پوری کا ہے۔ اسے بھی دیکھیے:

ہجر کی ایک شب

او، نہ ختم ہونے والی رات تو ختم ہو گی۔ کیا تیری سحر، قیامت کو ہو گی۔

او، مجھے بے چین کرنے والی شب، کیا میں ہی ایک آفت رسیدہ تجھے ایسی مل گئی جو طرح طرح کی آفتیں مجھ پر ڈھا رہی ہے۔ اُف ذرا رحم کر۔ آخر کس قصور کی پاداش میں تو نے میری وہ راتیں جو خوشی اور عشرت میں گزرتی تھیں

مجھ سے چھین لیں اور ان کالی کالی بھیانک راتوں کو میرے سپرد کر دیا جو ایک گھڑی مجھے چین سے نہیں سونے دیتیں۔

اُفوہ۔ ابھی تو ایک بجا ہے، خدا جانے کب صبح ہوگی۔ کیا صبح ہو جائے گی نہیں ہرگز نہیں۔ یہ ستانے والی رات کب مجھے چھوڑتی ہے۔ یہ اگر چھوڑ دے تو صبح ہونا کوئی بڑی بات نہیں، مگر آہ اس نے تو مجھے مول لے لیا ہے۔ میری اچھی اچھی راتیں مجھ سے چھین لیں اور یہ قیامت خیز ڈراؤنی اور کبھی نہ ختم ہونے والی راتیں میرے گلے ڈالیں۔

میری اچھی راتو۔ آؤ خدا کے لئے جلد آؤ تمہارے لئے میں بے چین ہوں بے قرار ہوں۔ تمہاری ایک شب ہاں صرف ایک شب کے لئے میں ساری زندگی نثار کرنے کو تیار ہوں۔

جا اُو شبِ فراق جا تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ جا۔ نہ ستا۔ بہت ستا چکی ہوں۔ پہروں رلا چکی۔ رات بھر بے کل رکھا۔ ایک منٹ کو بھی قرار نصیب نہ ہوا۔ جا اور میری وہی راتیں بھیج جن کے لئے میں تڑپ رہی ہوں سسک رہی ہوں۔

میری اچھی اچھی راتو! اے وہ راتو جن میں، ہمیشہ میں دلکش اور شیریں خواب ہی دیکھا کرتی تھی سچ بتانا کیا میں نے تمہاری قدر نہیں کی ؛ اس لئے تم مجھ سے خفا ہو گئیں۔ بیشک میں نے تمہاری ناقدری کی۔ اپنی غفلت سے تجھے کھو دیا مگر اب عاجزی کرتی ہوں، منت کرتی ہوں۔ آؤ اور مجھ پر رحم کرو۔ دیکھو میں کیسی تڑپ رہی ہوں۔ تمہارے بغیر کسی کروٹ چین نہیں، کسی پہلو قرار نہیں۔

ہر چیز کی انتہا ہوتی ہے۔ خدایا خوشی کی راتیں چھین گئیں تو مصیبت کی راتوں کا کب خاتمہ ہوگا۔ سچ ہے دنیا میں اچھی چیز کم رہتی ہے۔ خوبصورت پھول بہت جلد کملا جاتے ہیں۔ حسن چند روزہ ہے اور شباب ادھر آیا ادھر گیا۔

مجھ سے روٹھ جانے والی راتو کب تک مجھ سے بگڑی رہو گی۔ کب تک مجھے ترساؤ گی۔ للہ! آؤ اور زندگی بھر مجھ سے جدا نہ ہو۔ میں تمہاری اب بے حد قدر کروں گی۔

غم نصیب

”کوثر“

اس کے بعد نقاد بابت ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۷ء میں قمر زمانی کا کوئی مضمون نظر نہیں آتا۔ نقاد بھی اس کے بعد بند ہو گیا۔ چھ مہینے کے وقفے کے بعد جولائی ۱۹۱۸ء میں نقاد طلوع ہوا لیکن دوسرے ہی مہینے سے پھر بند ہو گیا۔ جولائی ۱۸ء کے پرچے میں قمر زمانی کا ایک مختصر سا مضمون بہ عنوان "خیالات پریشان" ملتا ہے۔ یہ بھی دلگیر کو گدگدانے کے لئے ہے۔ اسے بھی دیکھ لیجئے :-

خیالات پریشان

کوئل کی بے تابیاں، جنہیں ہم اس کی دل میں پیوست ہو جانے والی آوازوں سے اخذ کر کے اپنے ذوق شعری کے کام میں لاتے ہیں، کسے خبر ہے کہ وہ کیا ہیں آپ کہیں گے کہ اس کی آواز اک نالہ ہے، اک مسلسل فریاد ہے۔ اک شیون ہے۔ بے تاب۔ اک آہ ہے مضطرب۔ مگر شاید اس سے زیادہ ناقابل عفو غلطی کوئی نہیں ہو سکتا کہ اس غریب کا تنہا ذریعہ مسرت و شادمانی اک سرمایۂ جان گدازی سمجھا جاتا ہے۔

آپ نے نہیں لیکن میں نے تو اس کو ایسی حالت میں دیکھا ہے جب وہ خاموش اور بالکل خاموش ہے اور نہیں کہہ سکتی کہ اس وقت میں نے اس کی دلگیریوں سے کیا کیا صدمے اٹھائے ہیں۔ کیسے سمجھاؤں کہ حقیقتاً وہ اس وقت بے تاب نہیں ہوتی جب تم اسے اک صدائے بے قرار محسوس کرتے ہو بلکہ اس کی کراہ تو اس کی خاموشی ہے جسے صرف ایک مجبور محبت ہی سمجھ سکتا ہے ہجر و مفارقت میں تکلیف اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ ہم اپنے محبوب سے دور ہیں بلکہ اذیت تو اس خیال سے ہوتی ہے کہ اسے اس دوری کا بھی علم نہیں۔

دنیا میں محبت سے زیادہ موذی چیز کوئی نہیں اگر اس کا تعلق صرف دل سے ہو اور روح اس سے آشنا نہ ہو، وہ لوگ جن کی روح اس درد کو محسوس کرتی ہے مسیحائی کر سکتے ہیں۔

میں خط کسی کو نہیں لکھتی مگر اس وقت جب مجھے معلوم ہو جائے کہ اس کی نمائش نہ کی جائے گی۔ حالانکہ نقاد میں مضمون لکھتے وقت مجھے کبھی اس کا خیال نہیں ہوتا۔ یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ حقیقت کو چھپاتا ہے اور تصنع کو ظاہر کرتا ہے۔ ہر چند یہ بھی اک آرٹ ہے[1]

"قمر زمانی"

---

[1] دیکھئے نقاد بابت جولائی ۱۹۱۷ء ص ۷، مملوکہ بشیر ضیائی صاحب لاہور۔

جنوری ۱۹ء میں نقاد پھر جاری ہوا لیکن چھ مہینے بعد بند ہوگیا۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں پھر نکلا۔ لیکن صرف دو پرچے شائع ہوئے، ایک جنوری میں دوسرا دسمبر میں۔ نقاد کا آخری شمارہ جنوری ۲۱ء میں چھپا اور اس کے بعد پھر اسے ابھرنے کی نوبت نہ آئی۔ ان پرچوں میں بھی قمر زمانی کا کوئی خط یا مضمون نظر نہیں آتا۔ خطوط کے مسودات میں بھی نہ تو دلگیر کے خطوط نظر آتے ہیں نہ قمر زمانی کے۔ صرف ایک خط مرقومہ ۱۹ فروری ۱۸ء موجود ہے۔ یہ قمر زمانی کا ہے اور بریلی سے ڈالا ہے۔ اس سے پہلے قمر زمانی کا جو خط نقل کیا گیا ہے وہ ۹ ستمبر ۱۷ء کا تھا گویا ۱۹ فروری ۱۸ء کا خط پورے چھ مہینے بعد لکھا گیا ہے۔ قمر زمانی کا آخری خط بھی ملاحظہ کرتے چلیے۔

بریلی ۱۹ فروری ۱۸ء

میرے دونوں خط آپ کو مل گئے ہوں گے۔

صرف ایک کا جواب آپ نے دیا۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ میں کیا کہتی اگر آپ ایک کا بھی لطف نہ فرماتے۔ دل پہ کیا گزر گئی۔ مجھے معلوم ہے۔ مگر اس علم سے مجھے سوائے تیرے اس کے اور کوئی اندیشہ نہیں کہ کہیں آپ پر عالم یاس و نامرادی ہی تو نہیں جس سے آپ اس زمانے میں تنہا مالک و فرمانروا ہیں کسی ایسے عزم کا اعلان مجھ پر نہ کر دیں جس کا جواب میرے پاس سکوت اور صرف سکوت ہو۔ کیوں بناتے ہو۔ اللہ اللہ جس شخص کے دل پہ اس وقت تک کچھ نہ گزری ہو، مگر ناگذشتنی، وہ مجھے یقین دلاتا ہے کہ یہ سب کچھ واقعہ ہے۔ خیر میں اس کے تسلیم کرنے کے لیے آمادہ ہوں اگر آئندہ کے لیے آپ میری محبت آزمانے سے باز آجانے کا وعدہ فرمائیں۔ میں سچ عرض کرتی ہوں کہ دلگیر صاحب آپ کی طرف سے میرا دل شکایتوں سے لبریز ہے اور میں یقیناً کسی نہ کسی دن اپنا دل ان کے بیان سے ہلکا کروں گی لیکن ابھی نہیں ورنہ آپ کہیں گے کہ عجیب بد اخلاق عورت ہے کہ خط و کتابت شروع ہوتے ہی.........

میرے دوسرے خط میں شاید آپ نے کوئی ایسی بات نہیں پائی کہ جواب دینے کی تکلیف گوارا فرماتے۔ مارچ میں میرا بھوپال جانا یقینی ہے اور اگر آپ نے اجازت دی تو ایک وقت کے لئے آگرہ اُتر کر تاج دیکھنا پسند کروں گی۔

اور ہاں یہ کیا حرکت ہے کہ آپ نے دفترِ نقاد کا چھپا ہوا فارم لے کر چھ آنے اتار دیا۔ کیا آپ کوئی کاروباری خط لکھنے بیٹھے تھے۔

آخر نقاد کی اس بے رنگی کا سبب ہے۔ کیا آپ کی رنگینیاں اب اس سے بہتر کسی مصرف کی متلاشی ہیں۔ نہ آپ نے مجھے کبھی اس مسئلہ میں رازدار بنایا ہے نہ بنائیں گے۔ پھر میں غریب کیا کر سکتی ہوں۔ سوائے اس کے کہ نقاد اور صاحب نقاد کی خیر مانگوں۔

میں ایڈیٹر کانفرنس میں شرکت کرنے کی تیاریاں کر رہی ہوں۔ اس لئے جلد مضمون بھیجنے کا وعدہ تو نہیں کرتی۔ لیکن یہ ضرور یقین دلاتی ہوں کہ آپ چاہے خفا ہو جائیں لیکن اب نقاد کو ناراض نہ کروں گی۔ چوتھے صفحہ پر کچھ "خیالات پریشان" جمع کر کے پیش کئے جاتے ہیں۔ خدا کرے پسند آجائیں اور نقاد کے صفحات میں بار پا سکیں۔

آپ کی
"قمر"

اسی خط کے آخر میں جن "خیالات پریشان" کا ذکر ہے وہ جولائی ۱۹۱۸ء کے نقاد میں شائع ہو چکے ہیں اور پچھلی سطور میں ہم نے انہیں نقل کر دیا ہے۔ اس خط کا انداز بتایا ہے کہ دگیر صاحب۔ قمر زمانی سے پوری طرح بد دل ہو چکے ہیں اور شاید بہت دنوں سے ان کے خطوط کے جوابات نہیں دیئے۔ خطوط کے مسودات جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں ان میں دگیر کا کوئی خط نہیں ہے۔ حالانکہ اوپر کے خط سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قمر زمانی نے انہیں کئی خط لکھے تھے اور انہوں نے صرف ایک کا جواب بڑی بے دلی سے دفتر نقاد کے ایک اشتہاری کاغذ پر لکھ دیا ہے۔ لیکن یہ خط بھی دستیاب نہیں ہے۔

قمر زمانی کے جو دو تین خط اوپر نقل کئے گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ قمر زمانی از سر نو دگیر کو اپنی محبت کا یقین دلانا چاہتی ہیں۔ لیکن دگیر کو چونکہ ان کے عورت ہونے میں شبہ ہے اور یہ شبہ یقین کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ اس لئے انہیں قمر زمانی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ ۱۹؍ فروری ۱۸ء کے خط کے بعد قمر زمانی بھی مجبوراً خاموش ہو گئیں اور قمر زمانی اور دگیر کے درمیان عاشقانہ خط و کتابت کا یہ دلچسپ ڈرامائی سلسلہ کم و بیش دو سال مسلسل قائم رہنے کے بعد ختم ہو گیا۔ دگیر کو حقائق کی خبر ہوئی تو وہ اندر سے بالکل بجھ گئے اور کچھ دنوں بعد نقاد بھی ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

نقاد اور مدیرِ نقاد کی زندگی پر ایک نظر

نقاد کا پہلا پرچہ جنوری ۱۹۱۳ء میں طلوع ہوا اور پورے دو سال تک ہر مہینے پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ اس کی جلد اول جنوری ۱۹۱۳ء تا دسمبر ۱۹۱۳ء اور جلد دوم جنوری ۱۹۱۴ء تا دسمبر ۱۹۱۴ء راقم الحروف کے پاس موجود ہیں۔ اس کے بعد پرچے کی مالی حالت خراب ہونے لگی۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں اس کے صرف دو شمارے شائع ہو سکے ایک جنوری کا پرچہ دوسرے فروری اور مارچ کا مشترک پرچہ، دوسرے پرچہ میں "بعنوان" نقاد کا عالم سکوت۔ دلگیر نے لکھا ہے کہ۔

"فروری اور مارچ کا یکجائی پرچہ اس لیئے نکالا جاتا ہے کہ پبلک نقاد کی زندگی کا فیصلہ کر دے اور ناظرین نقاد کو اصل حال معلوم ہو جائے۔ اس نمبر کی اشاعت کے بعد میں ملک کے مختلف شہروں میں نقاد کی ترقی و اشاعت کے لئے دورہ کروں گا اور کافی خریدار پیدا ہونے کی صورت میں نقاد اپریل ۱۹۱۶ء سے پھر اسی آب و تاب سے شائع ہوگا ورنہ اسی کو آخر نمبر سمجھنا چاہیئے"

گویا "نقاد" کی تیسری جلد صرف تین مہینوں کے دو پرچوں پر مشتمل ہے۔ یہ جلد محترمی بشیر حسین ضیائی (لاہور) کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ میں نے انہیں کے کتب خانے سے استفادہ کیا ہے۔

دلگیر نے فروری مارچ ۱۹۱۵ء کے پرچے میں اعلان کیا تھا کہ وہ ایک سال بعد اپریل ۱۹۱۶ء میں نقاد کو دوبارہ جاری کریں گے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکے اور نقاد اپریل ۱۹۱۶ء کے بجائے اپریل ۱۹۱۷ء میں یعنی پورے دو سال بعد پھر منظر عام پر آیا اپریل کے شمارے میں مدیرِ نقاد نے خود اس کی صراحت ص ۴۴ پر اس طور پر کر دی ہے

"آج نقاد پورے دو سال کے بعد حاضر ہوتا ہے"۔

اپریل ۱۹۱۷ء سے دسمبر ۱۹۱۷ء تک برابر پرچہ نکلتا رہا لیکن اس کے بعد پھر بند ہو گیا۔ اس طرح نقاد کی یہ چوتھی جلد صرف نو پرچوں پر مشتمل ہے۔ یہ جلد بھی راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔ لیکن اس میں مئی، اکتوبر، نومبر اور دسمبر کے پرچے نہیں ہیں۔ بشیر حسین ضیائی صاحب کے پاس چوتھی جلد کے سارے پرچے ہیں۔

دسمبر ۱۹۱۷ء کے بعد نقاد چھ مہینے تک بند رہا اور جولائی ۱۹۱۸ء میں پھر شائع ہوا جولائی ۱۹۱۸ء کے شمارے میں اس کی صراحت بھی مدیر کی جانب سے اس طور پر ملتی ہے

"دسمبر نمبر میں میں نے وعدہ کیا تھا کہ جنوری نمبر ایک ہفتہ بعد شائع ہو جائے گا۔ یہ اچھا نہ معلوم ہوا جولائی میں جنوری نمبر شائع کیا جائے۔ اس لئے جنوری نمبر کے بجائے جولائی نمبر نکالا جاتا ہے اور جنوری سے جون تک چھ ماہ کی جبریہ تعطیل منائی جاتی ہے۔ خریداروں کو چھ ماہ جبریہ تعطیل کے حساب خریداری میں مجرا کر دیئے جائیں گے اور ان کے حساب میں چھ ماہ کا اور اضافہ کر دیا جائے گا۔"

لیکن اس پرچے کے بعد نقاد پھر نہ نکل سکا اور اس کی پانچویں جلد صرف ایک شمارے یعنی جولائی ۱۹۱۸ء کے پرچے ہی تک محدود رہی۔ یہ پرچہ بھی ضیائی صاحب کے پاس ہے۔ جولائی کے پرچے کے بعد ۱۹۱۸ء میں کوئی پرچہ شائع نہیں ہوا۔ لیکن جنوری ۱۹۱۹ء میں نقاد پھر منظر عام پر آیا۔ اس میں "عذر دستگیر" کے عنوان سے شاہ دستگیر نے پھر اعلان کیا کہ

"جولائی ۱۹۱۸ء کا نقاد ناظرین کو مفت نذر کرتے ہیں اور ان کے حساب میں اس کی قیمت نہ لگائیں گے۔ آپ یوں سمجھئے کہ دسمبر ۱۹۱۷ء کے بعد نقاد ایک سال بند رہا۔ بجائے جنوری ۱۹۱۸ء جنوری ۱۹۱۹ء سے پرچہ شائع ہوتا ہے۔"

چنانچہ جنوری ۱۹۱۹ء سے مئی ۱۹۱۹ء تک پانچ مہینے نقاد نکلتا رہا۔ اس کے بعد چھ مہینے بند رہا یعنی جون، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر اور نومبر ۱۹۱۹ء کا پرچہ شائع نہیں ہوا۔ دسمبر ۱۹۱۹ء کا پرچہ البتہ شائع ہوا۔ اس طرح نقاد کی چھٹی جلد جنوری ۱۹۱۹ء تا دسمبر ۱۹۱۹ء صرف چھ پرچوں پر مکمل ہو گئی۔ دسمبر کے پرچے پچھلے چھ مہینوں میں نقاد کے غیر حاضری کی معذرت مدیر کی جانب سے موجود ہے۔

دسمبر ۱۹۱۹ء کے بعد جنوری ۱۹۲۰ء کا پرچہ بھی شائع ہوا۔ لیکن اس کے بعد پورے سال، دسمبر ۱۹۲۰ء کے پرچے کے سوا نقاد کا کوئی شمارہ شائع نہیں ہوا اس طویل غیر حاضری کی معذرت بھی دسمبر ۱۹۲۰ء میں موجود ہے اس طرح ۱۹۲۰ء کی ساتویں جلد صرف دو شماروں پر مشتمل ہے۔

آٹھویں جلد جس کا تعلق ۱۹۲۱ء سے صرف ایک پرچے کی ہے یعنی جنوری کے پرچے کے بعد نقاد کا کوئی شمارہ نہیں نکلا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ نقاد ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ اس تفصیل سے اندازہ ہوا ہو گا کہ ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۴ء کی دو مکمل جلدوں کے بعد "نقاد" پوری طرح سنبھالا نہیں لے سکا۔ کہنے کو اس کا زمانہ ۱۹۱۳ء کے بعد جنوری ۱۹۲۱ء تک چھ سات برسوں پر پھیلا ہوا ہے لیکن اس کے شماروں کی مجموعی تعداد پینتالیس[۵] سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ان پرچوں

کی تفصیل اوپر کی بحث کی روشنی میں مختصراً یہ ہے :۔

جلد اول ۱۹۱۳ء	۱۲ پرچے	جنوری تا دسمبر
جلد دوم ۱۹۱۴ء	۱۲ پرچے	جنوری تا دسمبر
جلد سوم ۱۹۱۵ء	۲ ″	جنوری فروری اور مارچ کا مشترک شمارہ
جلد چہارم ۱۹۱۷ء	۹ ″	اپریل تا دسمبر
جلد پنجم ۱۹۱۸ء	۱ ″	جولائی
جلد ششم ۱۹۱۹ء	۶ ″	جنوری تا مئی اور دسمبر
جلد ہفتم ۱۹۲۰ء	۲ ″	جنوری اور دسمبر
جلد ہشتم ۱۹۲۱ء	۱ ″	جنوری
سات جلدیں	۴۵ پرچے	

ماہ نامہ نقاد اپنے زمانے کا ایک اہم اور مقبول پرچہ تھا اس کے بانی و مدیر شاہ نظام الدین دلگیر تھے۔ سوا دو سال کے بعد جوائنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے اس میں قمر زمانی بھی شریک ہو گئیں تھیں۔ اس کے معاصر پرچوں میں دلگداز، مرقع عالم، المعارف، ادیب مخزن، دکن ریویو، اردوئے معلی، زمانہ، علی گڑھ منتھلی، الندوہ، عصر جدید، پنجاب ریویو، الناظر، لسان العصر، زبان، مشورہ، صلائے عام، تمدن، نظام المشائخ، اودھ ریویو، العصر اور معیار، خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مارچ ۱۹۱۴ء کے نقاد میں ایک مضمون بہ عنوان "اردو جرائد پر ایک نظر" شائع ہوا ہے۔ اس میں معاصر پرچوں کا ذکر تفصیل سے آیا ہے۔ آخری سطور میں لکھا ہے کہ

"مندرجہ بالا رسائل میں اب "العصر" زمانہ، علی گڑھ منتھلی، الناظر، صلائے عام، تمدن، نظام الدین مشائخ، نقاد، خاتون اور عصمت جاری ہیں۔ باقی افسوس ہے کہ بند ہو گئے۔ "علی گڑھ منتھلی" کی وہ شان باقی نہیں رہی جو پہلے تھی "صلائے عام" کبھی وقت بھی شائع نہیں ہوا۔ "العصر" ستمبر ۱۹۱۳ء سے شائع نہیں ہوا۔ اس کی زندگی کا خدا حافظ ہے۔ زمانہ، تمدن، خاتون اور عصمت نہایت بے قاعدہ شائع ہوتے ہیں اور ہمیشہ ایک دو ماہ کی تعویق کے ساتھ ملتے ہیں۔"

اس وقت تمام ہندوستان کے طول و عرض میں موقت الشیوع رسائل صرف تیس ہیں۔

۱۔ نظام المشائخ

۲۔ الناظر

۳۔ نقاد

جو ماہوار وقت پر شائع ہوتے ہیں [1]

نقاد کے لکھنے والوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا اور اس میں نئے پرانے سبھی اچھے لکھنے والے شامل تھے۔ نقاد کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۱۳ء میں نکلا تھا۔ اس پرچے میں مہدی افادی، ریاض خیر آبادی، نیاز فتح پوری، اکبر الہ آبادی، سیماب اکبر آبادی، ارشد تھانوی، پیارے لال شاکر میرٹھی، باغ اکبر آبادی، نواب شمشیر بہادر، انگر، شوق قدوائی، شاداب اکبر آبادی، سعید احمد مارہروی اور خان بہادر سلطان احمد اور بعض دوسرے ادیبوں کے نام نظر آتے ہیں۔ دوسرے پرچے میں مولانا حسرت موہانی، ضیائے عباس ہاشمی، قمر الحسن بدایوانی، حیات بخش رسا اور واسف اکبر آبادی، تیسرے پرچے میں عبدالرؤف فتح پوری، مولانا شبلی نعمانی، شہیر مچھلی شہری، چوتھے میں مولانا ابوالکلام آزاد، سیفر کاکوری، پانچویں میں صفدر مرزاپوری، اوج گیاوی، قیصر بھوپالی، مولانا حامد حسن قادری، چھٹے میں عزیز لکھنوی، بیخود الہ آبادی، ساتویں میں راز رامپوری، آٹھویں میں سید محمد فاروق شاہپوری، محوی لکھنوی، نوبت رائے نظر، محمد اسماعیل ذبیح، شفیق عماد پوری اور نویں پرچے میں خورشید علی حیدر آبادی، سید شمس اللہ قادری، باسط علی بسوانی، سید سجاد حیدر یلدرم، نذر سجاد حیدر، عبدالحلیم شرر، نظم طباطبائی، نوح ناروی، یاس ٹونکی اور سید عبدالعلی ندوی فتح پوری کے ناموں کا اضافہ ہوا ہے۔ ان ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ نقاد بہت جلد علمی و ادبی حلقوں میں مقبول ہو گیا تھا اور اسے سارے ممتاز اہل قلم کی معاونت حاصل ہو گئی تھی۔ لیکن اس پرچے کو اتنی جلد چمکا دینے اور اس کے گرد سارے اچھے لکھنے والوں کو جمع کر لینے میں زیادہ دخل خود اس کے مدیر شاہ دلگیر اور ان کے یار غار نیاز فتح پوری کی کوششوں کو تھا۔ نقاد جب بند ہو گیا اور نیاز فتح پوری نے قمر زمانی کا روپ دھار کر شاہ دلگیر سے اسے دوبارہ زندہ کرایا اور جب تک شاہ دلگیر و قمر زمانی کا ڈرامہ صیغہ راز میں رہا نقاد برابر ترقی کرتا رہا لیکن جیسے ہی یہ راز فاش ہوا شاہ دلگیر کو کچھ ایسا صدمہ پہنچا کہ وہ اندر سے بالکل بجھ گئے اور کچھ دنوں بعد نقاد بھی ختم ہو گیا۔

شاہ نظام الدین دلگیر جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے نیاز کے ہم عمر اور ان کے یاران نجد کے

---

[1] "نقاد" ص ۳۱ تا ۴۶ بابت مارچ ۱۹۱۴ء

ایک رکن تھے۔ یاران نجد کے ممتاز ارکان میں سے ل۔ احمد اور مخمور اکبرآبادی ابھی حیات ہیں۔ دونوں اردو کے نامور شاعر و ادیب ہیں۔ ل۔ احمد کلکتے میں ہیں اور مخمور اکبرآبادی کراچی میں، مخمور صاحب نے میری گذارش پر ۱۹۶۷ء میں ایک مضمون لکھا تھا جس کو میں "بزم نیاز و نگار" لے کے شائع کیا تھا اس میں مخمور صاحب نے یاران نجد کے اکثر ارکان کا ذکر کیا ہے لیکن خدا جانے کیوں اپنے ہم وطن شاہ دلگیر اکبرآبادی کا ذکر نہیں کیا۔ حضرت جوش ملیح آبادی نے شاہ دلگیر کے بارے میں لکھا ہے کہ

"رسالہ نقاد کے مدیر خاندان مشائخ کے چشم و چراغ، دراز قامت، دراز ریش، دراز دست، کوتاہ ہمت، بخل پسند، پُرکیسہ، تہی دست، کثیر السواد، قلیل الرماد، بخوشی میہمان، بکراہت میزبان، عقاب پنجہ، کبوتر مزاج، خانقاہ کی محراب میں قطب الاقطاب، حسینوں کی جناب میں پارۂ سیماب، کیا کیا خصوصیات بیان کروں شاہ صاحب کے۔ وہ اس قدر تلملا جاتے تھے، حسینوں کو دیکھ کر کہ ان کے حواس بجانہ رہتے تھے۔ راہ گلی میں ان کے ساتھ چلنا پھرنا بے حد خطرناک تھا اس لئے کہ جب کسی حسین چہرے پر ان کی نگاہ پڑجاتی وہ اپنے ساتھ کی پسلیوں پر اس قدر زور سے کہنی مارتے تھے کہ اس بے چارے کے منہ سے بے چیخ نکل جاتی تھی۔ اسی طرح جب وہ جھوم جھوم کر دیوانہ وار اپنا کلام سناتے تھے زور زور سے داد دینے والے کی ران پر اپنا پہاڑ سا ہاتھ اس قدر زور سے مارتے تھے کہ وہ غریب اچھل جایا کرتا تھا" [۲]

حضرت جوش ملیح آبادی کے ان الفاظ سے حضرت دلگیر کی شخصیت کا صرف ایک رُخ سامنے آتا ہے۔ انہوں نے دلگیر کی کمزوریوں پر طنزیہ لہجے میں تو بہت کچھ لکھ دیا ہے لیکن ان کے اوصاف کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ دلگیر ہی کے ساتھ یہ تخصیص نہیں جوش صاحب نے "یادوں کی بارات" جہاں کہیں اپنے معاصرین اور احباب کا ذکر کیا ہے زیادہ تر اسی روش کو اپنایا ہے۔ ان میں بعض ایسے معاصرین بھی شامل ہیں جن کا ذکر وہ خود اس سے پہلے نہایت اچھے الفاظ میں کر چکے ہیں چنانچہ ایک جگہ حضرت دلگیر کے متعلق لکھتے ہیں،

لے: "نگار پاکستان" ص ۲۵ تا ۳۱ بابت مئی جون ۱۹۶۷ء کراچی۔

لے: یادوں کی بارات ص ۸۵، ۴ مطبوعہ جوش اکیڈمی کراچی ۲۔ ۱۹۷۰ء طبع اول۔

"آہ شاہ صاحب تمہاری کس کس بات کو یاد کر کے روؤں، تمہاری کن کن خوبیوں پر ماتم کروں، تمہارا سا ادیب، تمہارا سا نقاد، تمہارا سا صاحب نظر، تمہارا سا سخن سنج، تمہارا سا خلوص پرور انسان شاید اب ہندوستانی نہ پیدا کر سکے گا۔ کاش اگر تم زندہ رہتے اور جوش کے سے انسان ہزار تم پر سے قربان ہو جاتے۔ مگر ظالم اور اندھی مشیت پر کس کا زور چل سکتا ہے"[1]

اب اگر جوش صاحب کے دونوں بیانات کو سامنے رکھیں تو یہی کہنا پڑے گا کہ ان میں سے کوئی ایک بیان ضرور غلط ہے۔ ان کے پہلے ہی بیان کو غلط اور مبالغہ آمیز کہنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ شاہ دلگیر کی ذات و صفات کے بارے میں دوسرے معاصرین نے جو کچھ کہا ہے وہ جوش صاحب کے پہلے بیان سے نہیں مندرجہ بالا سطروں سے مطابقت رکھتا ہے۔

افسوس کہ دلگیر کی زندگی اور فن پر اب تک کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا۔ اس لئے یہی نہیں کہ ادب کے قاری ان کی تفصیلات و جزئیات سے بے خبر ہیں بلکہ غضب یہ ہے کہ لوگ ان کے نام اور کام کو یکسر بھولے جا رہے ہیں۔ ان کی زندگی میں ان کا کوئی مجموعۂ نثر یا مجموعہ نظم شائع نہیں ہوا۔ وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے سید انتظام الدین شاہ جمالی ایم ایس سی (علیگ) نے دلگیر کے بارے میں ساٹھ صفحے کی ایک چھوٹی سی کتاب بہ عنوان "داغ دلگیر" شائع کی تھی۔ یہ کتاب شاہ دلگیر کے پوتے عزیز سید اعزاز الدین شاہ ولد سید ظفرالدین شاہ مقیم کراچی کے توسط سے مجھے دیکھنے کو ملی۔ اس کی پشت پر "تصنیفات حضرت دلگیر" کے عنوان سے جو اشتہار ملتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے بیٹوں نے دلگیر بک ڈپو کی جانب سے مندرجہ ذیل کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا تھا:۔

۱۔ آہ دلگیر (مجموعۂ غزلیات)

۲۔ مکاتیب دلگیر (مجموعۂ مکتوبات)

۳۔ مضامین دلگیر (مجموعۂ مقالات)

۴۔ "داغ دلگیر" (دلگیر کی وفات پر معاصرین کے قطعات تاریخی و تعزیتی خطوط منظومات اور مدیرانِ اخبار و رسائل کی آرا کا مجموعہ)

۵۔ دلگیر کے سو شعر

ان میں سے صرف ایک تالیف "داغ دلگیر" میری نظر سے گزری ہے۔ "داغ دلگیر"

---

[1] "داغ دلگیر" مرتبہ سید انتظام الدین شاہ جمالی ص ۵۰ مطبوعہ رفاہ عام پریس آگرہ ۱۹۳۲ء

کا تاریخی نام "بزمِ غمِ دگیر" ہے۔ "بزمِ غمِ دگیر" سے ۱۳۵۳ھ نکلتے ہیں۔ یہی اس کتاب کی تالیف اور شاہ دگیر کی وفات کا سال ہے۔ اس کتاب کے آغاز میں پروفیسر محمد افضال حسین قادری ایم ایس سی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ[1] نے بہ عنوان "حیاتِ دگیر" کی زندگی کے مختصر حالات اس طور پر لکھ دیئے ہیں۔

"سید نظام الدین شاہ نام، دگیر تخلص رئیس زمیندار آنریری مجسٹریٹ سجادہ نشین آستانہ عالیہ قادریہ تھے۔ آپ کی ولادت ۱۴ ربیع الثانی ۱۳۰۰ھ کو آگرہ میں میوہ کٹرہ میں ہوئی۔ آپ نسباً قادری اور حسباً جعفری۔ آپ کے والد مولانا سید عبدالقادر شاہ صاحب قیصر اور آپ کے مورثِ اعلیٰ مولوی سید امیر علی شاہ صاحب اکبرآباد کے شرفا و روساء میں سے تھے جن کا سلسلۂ نسب حضرت عبداللہ شاہ صاحب بغدادی تک پہنچتا ہے، جو بغداد شریف سے عَلَم خلافت حضرت پیرانِ پیر دستگیر علیہ رحمۃ لے کر ہندوستان میں تشریف لائے۔ یہ علم مبارک ہر سال زیارت گاہ خاص و عام ہوتا ہے۔ آستانہ عالیہ قادریہ میں ۱۰، ۱۱ ربیع الثانی کو نصب کیا جاتا ہے۔ یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ آپ کا خاندان نہایت ممتاز اور با اثر ہے اور آپ کے خاندان کے تمام افراد علم و فضل سے بہرہ یاب اور نہایت معزز و محترم رہے۔ شاہ صاحب کی ذات کو نقد و تبصرہ کی روشنی میں لانا ان کے عالمانہ، صوفیانہ و قادریہ و مدارج کی توہین ہے۔

ابتدائی تعلیم فارسی و عربی کی مولوی آل عمران صاحب کابلی نے دی، انگریزی میں انٹرنس تک آگرہ کالج میں تعلیم پائی۔ ۲۶ رجب ۱۳۲۲ھ مطابق ۷ر اکتوبر ۱۹۰۴ء کو آگرہ کے مشہور و ممتاز خاندان سادات میں آپ کی شادی ہوئی۔ ۱۹۰۶ء میں سفیر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۱ء میں ممبر کورٹ آف وارڈس مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۱ء تک نقاد جاری کر کے اپنے خیالات سے عالم کو مستفیض کرتے رہے۔ ۷ مارچ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۲ء تک آنریری مجسٹریٹ رہے۔ نثر طرازی اور شعر گوئی کا مذاق بچپن ہی سے رہا چنانچہ ۱۹۰۸ء سے برابر مختلف رسائل و اخبارات میں مضامین و غزلیں لکھتے رہے۔ ابتداً ناول نویسی

---

[1]: آج کل پروفیسر ڈاکٹر محمد افضال حسین قادری کراچی یونیورسٹی میں فیکلٹی آف سائنس کے ڈین ہیں۔

ے کی۔ مختلف رسائل و اخبارات کے اعزازی مدیر رہے۔ فن شعر میں باوجود شعر گوئی و شیریں گفتاری آپ نے کسی کے آگے زانوئے ادب تہ نہیں کیا۔ پڑھنے کا انداز دلکش تھا۔ آپ کے شاگرد اطراف ہند میں موجود ہیں مگر آپ کبھی اس بات پر فخر نہیں کرتے تھے۔ ۱۹۰۸ء سے ہندوستان کے مختلف مقامات پر مشاعروں میں تشریف لے جاکر اپنے دلپذیر کلام سے سامعین کی سامعہ نوازی کی۔ قبلہ و کعبہ حضرت مولانا پیر سید ابراہیم شاہ صاحب سیفی کے مرید اور راہ تصوف میں محو و مستغرق تھے۔ آپ کے علم و کمال سے ایک زمانہ فیض یاب و مشرف ہوا اور طالبین و مریدین نے آپ سے جملہ علوم و فنون میں اکتساب کیا .... مختلف عقائد کے لوگوں سے نہایت دوستانہ برتاؤ رکھتے تھے۔ انتقام لینے کی عادت بالکل نہ تھی۔ دنیا کے مکر و فریب سے ناآشنا تھے۔ مراسلت زندگی کا ضروری جز تھی۔ کتب بینی شرط حیات تھی۔ فطرتاً صفائی پسند تھے۔ خود ایک مخصوص طرز کے موجد تھے۔ نہایت باوضع متشرع اور اہل دل بزرگ تھے شعر دو بجے رات کو اٹھ کر کہتے تھے۔

گلشن دلگیر کی شادابی و تازگی کا باعث آپ کے پانچ نونہالان خوش اقبال ہیں۔ بڑے صاحبزادے سید انتظام الدین شاہ صاحب جمالی ایم ایس سی بی ٹی (علیگ) ہیں۔ جو شاہ صاحب کے سجادہ نشین ہوئے۔ دوسرے صاحبزادے سید قیام الدین شاہ صاحب بی اے (علیگ) ہیں جو اب قانون پڑھ رہے ہیں تین صاحبزادے لہ شعبہ ہائی اسکول میں تعلیم پا رہے ہیں شاہ صاحب کی یادگار میں شاہ دلگیر لائبریری قائم ہے جس میں کثیر التعداد کتب ہیں اور مختلف رسائل و اخبار دار المطالعہ میں آتے ہیں۔ ان کی دوسری یادگار ان کا دیوان و مضامین نثر و خطوط ہیں جو انشاء اللہ جلد شائع ہوں گے"۔

دلگیر کے کچھ حالات زندگی مع انتخاب کلام سری رام نے بھی لکھے ہیں[لہ]۔ ان کی تاریخ ولادت ۱۴ ربیع الثانی ۱۳۱۲ھ مطابق ۶ رجون ۱۹۳۱ء ہے۔ گویا شاہ دلگیر کا انتقال بحساب ہجری ترپن [۵۳] سال اور بحساب عیسوی اکیاون [۵۱] سال کی عمر میں ہوا ہے۔

"داغ دلگیر" میں وفات دلگیر سے متعلق متعدد شاعروں کے قطعات تاریخی ملتے ہیں۔

لہ: خمخانۂ جاوید ص ۱۹۵ جلد سوم مملوکہ انجمن ترقی اردو کراچی۔

ان قطعہ نگاروں میں مولانا احسن مارہروی، مولانا آزاد انصاری، حضرت ثاقب کانپوری، مولانا حامد حسن قادری، حضرت ریاض خیر آبادی، سیماب اکبر آبادی، شفق عماد پوری، مولانا ضیا احمد بدایونی، نوح ناروی، نجم آفندی اور رضا علی وحشت کلکتوی جیسے بزرگ شاعر و ادیب بھی شامل ہیں، مولانا حامد حسن قادری نے اردو فارسی میں متعدد تاریخی قطعے کہے ہیں اور سن عیسوی و سن ہجری دونوں نکالے ہیں اور عجیب عجیب طرح سے نکالے ہیں مثلاً ایک قطعہ کا آخری شعر ہے ؂

سال فوتش گفتہ ام حامد کہ اند ہجر وے
آہ و افسوس و ملال و صدمہ و غم بیحداست

آخری مصرعے میں "بیحداست" سے مراد یہ ہے کہ ان الفاظ کے آخری حروف کو چھوڑ کر باقی حروف کے اعداد کو جمع کرنے سے تاریخ نکلے گی۔

اسی طرح ایک قطعے کا آخری شعر یہ ہے ؂

دلم بگفت کہ بے دل ز مرگِ اُو گشتند
وفا و ناز و کرم ذوق و شوق و شعر و سخن

یہاں "بے دل گشتند" سے مراد یہ ہے دوسرے مصرعے کے لفظوں کے درمیانی حروف کو چھوڑ کر باقی حروف کے اعداد کو جمع کرنے سے سال وفات برآمد ہوگا۔ ایک اور قطعہ میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ لفظوں کو "بے سر و پا" کرنے یعنی شروع اور آخر کے حروف کو چھوڑ کر باقی حروف کے اعداد جمع کرنے سے تاریخ نکل آتی ہے۔ شعر یہ ہے ؂

سب پے سر و پا ہو گئے دستگیر کے جانے سے اب
لطف و کرم، شعر و سخن، عشق و وفا وصل و ادا

"داغ دستگیر" میں قطعات تاریخی اور منظومات کے ساتھ ساتھ معاصرین کے تعزیتی خطوط اور وفات سے متعلق مختلف اخبارات و رسائل کے تراشے بھی شامل ہیں۔ سبھی نے نہایت اچھے الفاظ میں دستگیر کی علمی و ادبی کارناموں کو سراہا ہے۔

زیر نظر کتاب میں شاہ دستگیر کے جو خطوط قمر زمانی کے نام درج کئے گئے ہیں ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے دور کے کتنے بلند پایہ نثر نگار تھے۔ نثر میں ان کا تعلق انشائے لطیف کے اس دبستان سے ہے جس کے بانی میر ناصر علی اور مہدی افادی اور جس کو نقطۂ عروج تک پہنچانے والے مولانا نیاز فتح پوری اور خلیقی دہلوی وغیرہ تھے۔ دستگیر نثر نگار کے ساتھ ایک خوش گو شاعر بھی تھے اور نظم و غزل دونوں میں حسن و محبت کی اس رومانی فضا کو برقرار رکھتے تھے جو اس زمانے اردو شاعری و ادب کی نمائندہ فضا کہی جا سکتی ہے۔ ان کی بعض غزلیں خطوط کے ساتھ

درج کی جا چکی ہیں، چند اشعار بطور نمونہ اس جگہ مزید نقل کئے جاتے ہیں ؎

یہ میکدہ کی بھیڑ یہ انبوہ یہ ہجوم
ہم تو نکل کے کھوئے گئے خانقاہ سے

میری شہرت کے سوا آپ کے گیسو کے سوا
نام مشہور ہے دنیا میں پریشان کس کا

میکدے میں ذکر ہے دستگیر کا
لاؤ بالی ہے بڑا مے نوش ہے

نشۂ مے آنکھ میں کچھ نیند کچھ انگڑائیاں
پھر کسی کو بزم میں یوں جلوہ آرا دیکھئے

دونی ہوں ساقیا تری آنکھوں کی مستیاں
ہاں ایک جام اور شب ماہتاب میں

تعریف سن کے حضرت یوسف کے حسن کی
غصے سے بند کھول رہے ہیں نقاب کے

تم ہو تغافل آشنا تم سے کہے یہ جا کے کون
بیٹھا ہوا ہے ایک شخص حالت انتظار میں

میں نہیں بھولا ابھی تک آپ کو
آپ نے دل سے بھلایا کس طرح

دستگیر سخن کی ترے شہرت ہے خدا داد
وہ کون سی محفل ہے کہ چرچا نہیں ہوتا

شاہ دلگیر کے علمی و ادبی خدمات کی سب سے اہم اور بڑی یادگار ماہنامہ "نقاد" ہے۔ نقاد کے وہ تنہا مالک و مدیر تھے۔ اور جنوری ۱۹۱۳ء سے مارچ ۱۹۳۵ء تک پابندیٔ وقت کے ساتھ نکالتے رہے، لیکن مسلسل مالی نقصان کے سبب اپریل ۱۹۱۵ء سے بند ہوگیا۔ دو سال بند رہنے کے بعد اپریل ۱۹۱۷ء میں جب دوبارہ نکلنا شروع ہوا تو دلگیر نے قمر زمانی بیگم کو بھی جوائنٹ مدیر کی حیثیت سے اس میں شامل کر لیا۔ چنانچہ اپریل کا افتتاحیہ "نقاد کی زندگی کا دوسرا دور اور میں" قمر زمانی کا ہی لکھا ہوا ہے۔ نیاز فتح پوری شروع ہی سے دلگیر اور نقاد کے معاون خاص تھے۔ قمر زمانی کا روپ دھار لینے کے بعد نقاد کے حق میں ان کی قلمی معاونت دو چند ہوگئی۔ پہلے وہ صرف نیاز فتح پوری کے نام سے لکھتے تھے بعد کو قمر زمانی کے نام سے بھی لکھنے لگے بلکہ بعض مضمون (جیسا پچھلے صفحات میں تفصیل گذر چکی ہے) انہوں نے دلگیر کی طرف سے بھی لکھے۔ گرچہ وہ دلگیر ہی کے نام سے شائع ہوئے۔ میری مراد دلگیر کے اس مضمون سے ہے جو اپریل ۱۹۱۷ء میں قمر زمانی بیگم کے افتتاحی مضمون کی تعریف میں بہ عنوان "افتتاح افتتاحیہ" شائع ہوا ہے۔ نیاز فتح پوری نے قمر زمانی بیگم کے نام سے نقاد میں جو مضامین لکھے ہیں تقریباً وہ سارے کے سارے پچھلے صفحات میں متعلقہ خطوط کے ساتھ نقل کئے جا چکے ہیں۔ مختصراً ان کی فہرست یہ ہے:۔

۱۔	نقاد کی زندگی کا دوسرا دور اور میں (نثر)	اپریل ۱۹۱۷ء
۲۔	ایک جاندار پتی (نثر)	اپریل ۱۹۱۷ء
۳۔	اے کلی (نثر)	مئی ۱۹۱۷ء
۴۔	افکار جمیلہ (غزل)	مئی ۱۹۱۷ء
۵۔	کچھ اپنی نسبت (نثر)	جون ۱۹۱۷ء
۶۔	ساون کی ایک رات (نثر)	جولائی ۱۹۱۷ء
۷۔	افکار جمیلہ (غزل)	اگست ۱۹۱۷ء
۸۔	خیالات پریشان (نثر)	جولائی ۱۹۱۸ء

لیکن نیاز فتح پوری نے قمر زمانی بیگم کے علاوہ بعض دوسری خواتین مثلاً کوثر، ناہید، کہکشاں اور بلقیس وغیرہ کے فرضی ناموں سے بھی نقاد میں کئی انشائیے، افسانے اور خطوط لکھے ہیں۔ یہ ساری چیزیں نقاد کے صفحات میں نظر آتی ہیں اور تقریباً سبھی قمر زمانی و مدیر نقاد کے مکتوبات کے ساتھ مناسب جگہوں پر نقل کی جا چکی ہیں۔

نیاز فتح پوری جنہوں نے "قمر زمانی بیگم" اور دوسری خواتین کے نام سے نقاد میں بہت

کچھ لکھا ہے ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے اور ۲۴ مئی ۱۹۶۶ء کو بمقام کراچی وفات پائی۔ ان کی زندگی اور فن کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس جگہ کسی تفصیل میں جانا مناسب نہیں معلوم ہوتا[1] یوں بھی اس کتاب کا اصل مقصود نیاز فتح پوری پر قلم اٹھانا نہیں بلکہ شاہ نظام الدین دگیر کے ان مکتوبات کو سامنے لانا ہے جو انشائیہ لطیف کے اعلیٰ نمونے ہونے کی حیثیت سے اردو نثر کا قیمتی سرمایہ ہیں اور جو اب تک ہماری نظروں سے اوجھل تھے۔ ساتھ ہی مولانا نیاز فتح پوری کی ان قیمتی تحریروں کو یکجا و محفوظ کرنا ہے جو قمر زمانی بیگم اور بعض دوسری خواتین کے نام سے رسائل میں بکھری پڑی ہیں اور مورخین و محققین کو مغالطوں میں ڈال رہی ہیں۔

---

[1]: نیاز کی زندگی اور فن کی تفصیل کے لئے دیکھئے نگار پاکستان نیاز نمبر جلد اول و دوم سالنامہ ۱۹۶۳ء مرتبہ راقم الحروف۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی ۲ اہم کتابیں

اقبال سب کے لئے

یہ اقبال پر ایک مستند کتاب ہے جس میں اقبال کی سیرت وسوانح، فکر و فن، نظریات و عقائد، تعلیمی افکار، سیاسی خدمات، فکری و تخیلی ارتقا، ان کے عوامل، محرکات و منظر و پس منظر کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ صفحات ۵۲۸ - بڑا سائز۔ مجلد

میر انیس: حیات و شاعری

یہ کتاب میر انیس کے اسلوب فن اور ان کے جملہ اسالیب پر حاوی ہے۔ غزل و قصیدہ سے لے کر رزمیہ و مثنوی تک تمام اسالیب ان کی مرثیہ نگاری میں در آئے ہیں۔ یہ مختصر کتاب اپنی جامعیت کی وجہ سے دیگر کتابوں پر بھاری ہے۔

بڑا سائز۔ صفحات ۲۵۶۔ مجلد

اردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی